إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

مئی ۲۰۱۸ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ البرہان لاہور

جلد ۲۲، شمارہ ۵، مئی ۲۰۱۸ء/ شعبان ۱۴۳۹ھ

مشمولات

تعلیم، تحقیق، تربیت، تزکیۂ نفس

O فکر و نظر/ تزکیۂ نفس

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں ۴

O تعلیم

تعلیم میں ماضی، حال اور مستقبل کی اہمیت — خواجہ غلام السیدینؒ ۵

O دینی مدارس

- عصری تعلیم کے حوالے سے دینی مدارس کے وفاقوں کا مؤقف ۱۰
- وفاقوں کے مشترکہ مؤقف پر البرہان کا تبصرہ؟ — ڈاکٹر محمد امین ۱۴

O جدید تعلیم

تعلیم کا المیہ اور ایک استاد کا نوحہ — پروفیسر ملک محمد حسین ۲۰

اسلام، پاکستان اور مغرب

O اسلام اور پاکستان

- مغرب زدہ مسلم ممالک کے علماء کا پاکستان پر ثقافتی حملہ ۲۳
- اسلامی پاکستان کا ایک اُبھرتا ہوا مسئلہ۔ سیکولر عدلیہ — مدیر ۲۴
- 'عورت راج آرہا ہے' — پروفیسر عاصم حفیظ ۲۶
- پاکستان میں انتخابی معرکہ — پروفیسر ملک محمد حسین ۲۷

O اسلام اور مغرب

- جدیدیت اور جدید ریاست کی ناکامی — سید خالد جامعی ۳۵
- لبرل ازم، الحاد اور اسلام (آخری قسط) — حامد کمال الدین ۴۷

البرہان آن لائن مطالعہ کیجیے: www.al-burhan.com

فکر و نظر

بُلّھے شاہ اساں مرنا ناھیں

(بلّھے شاہ! ہمیں موت نہیں آئے گی)

پنجابی کے معروف صوفی شاعر بلّھے شاہ کہتے ہیں ؎

بھلے شاہ اساں مرنا ناہیں گور پیا کوئی ہور

یعنی بلھے شاہ ہم تو زندہ رہیں گے۔ یہ جو مرا پڑا ہے کوئی اور ہے۔ فارسی والوں نے اسے یوں کہا ہے ؎

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

یعنی جو دل عشق کی وجہ سے زندہ ہو اُسے موت نہیں آتی لہٰذا ہم بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اگر ہم اس شعر کو صوفی شاعر کی صوفیانہ اور شاعرانہ تعلّی نہ سمجھیں اور اس کے گہرے معانی کھوجنے کی کوشش کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ اللہ کی محبت آدمی کو زندہ رکھتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ جو (میری محبت میں) میری راہ میں جان سے بھی گزر جاتے ہیں، وہ زندہ رہتے ہیں انہیں مردہ نہ کہو....اور زندگی کا ایک بڑا مظہر چونکہ کھانا پینا ہے لہٰذا مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ وہ نہ صرف زندہ رہتے ہیں بلکہ کھاتے پیتے ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے....لیکن تم اس بات کو سمجھ نہیں سکتے۔

بعض اہلِ دل اللہ کے ساتھ اس طرح کی 'شوخی' کر جاتے ہیں۔ ایک دن ہمارے دوست پروفیسر ارشد جاوید صاحب (اسلامی ذہن کے معروف ماہرِ نفسیات) کہنے لگے: میں نے اللہ میاں سے کہہ دیا ہے کہ میں ابھی نہیں مروں گا۔ مجھے ابھی بہت سے ضروری اور اچھے کام کرنا ہیں...(ایک یہ کہ اسلامی اور نفسیاتی اصولوں پر ایک سکول قائم کرنا ہے) لہٰذا میں نے اللہ میاں سے کہہ دیا ہے کہ میں ۹۰ سال کی عمر سے پہلے نہیں مروں گا۔

بہرحال اپنی کیفیت تو اس سے بالکل مختلف بلکہ اس کے برعکس ہے۔ ہم تو ڈرتے رہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن میرٹ پر فیصلہ کیا (اور وہ عادل ہے، میرٹ پر ہی فیصلے کرے گا) تو پھر ہمارا کیا بنے گا؟ ہم جب سوچتے ہیں کہ ہمارا نامۂ اعمال خالی ہے اور میرٹ پر ہمارے بخشے جانے کا امکان نہیں تو ہم گھگھیانے لگتے ہیں کہ اللہ میاں! سنا ہے آپ کی رحمت آپ کے غضب پر حاوی ہے اور آپ ستّر ماؤں سے زیادہ محبت کرنے والے ہیں۔ تو اللہ میاں! مجھے انصاف نہیں چاہیے، مجھے آپ کا رحم چاہیے۔ اے اللہ! آپ کو اپنی صفت رحمت کا واسطہ! مجھے جہنم کی آگ سے بچا لیجیے اور اپنے نبیٔ رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے قدموں میں جگہ عطا فرما دیجیے۔

تعلیم

خواجہ غلام السیدینؒ[۱]

تعلیم میں ماضی، حال اور مستقبل کی اہمیت

[خواجہ غلام السیدینؒ کا یہ مضمون ماہنامہ 'رہنمائے تعلیم' لاہور کے جنوری ۱۹۳۷ء کے شمارہ سے لیا گیا ہے جو تعلیم جدید نمبر کے طور پر شائع ہوا۔ ماہنامہ رہنمائے تعلیم بعد میں گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ ضلع گوجرانوالہ کے علمی تعلیمی ماہنامے کے طور پر شائع ہوتا رہا۔ 'رہنمائے تعلیم' کا یہ خاص نمبر ملک امیر حسین، سابق طالب علم ایس وی کلاس گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ (سیشن ۵۳۔۱۹۵۲) نے اپنے ذخیرۂ کتب سے مرحمت فرمایا۔ نائب مدیر]

مشکن گر تو می خواہی حیاتِ لا زوال　　رشتۂ ماضی و استقبال و حال

''اگر تو ہمیشہ کی زندگی کا طالب ہے تو ماضی، حال اور مستقبل کے رشتہ کو منقطع نہ کر۔''

موجودہ تعلیم پر نکتہ چینی کرنا آج کل ہر لکھنے پڑھنے اور تقریر کرنے والے کا شیوہ ہو گیا ہے اور اس کے لیے اہل اور نا اہل کی شرط بھی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ ان اعتراضات کی نوعیت بھی بہت مختلف ہوتی ہے۔ کسی کو یہ شکایت ہے کہ اس تعلیم سے لوگوں میں حقیقی تہذیب نہیں پیدا ہو رہی۔ کسی کا رونا ہے کہ نوجوان لکھ پڑھ کر اپنا پیٹ پالنے کے قابل بھی نہیں بنتے۔ بعض کو یہ اعتراض ہے کہ اس سے ہندوستانیوں کی رسم پرستی اور قدامت پسندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بعض اس بات سے بیزار ہیں کہ طلبہ لکھ پڑھ کر اپنی تہذیب و تمدن کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں اور ہر بات میں مغرب کی کورانہ تقلید کرنا چاہتے ہیں۔ سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ بچوں کی صحیح تربیت نہیں ہوتی اور ان میں دین پسندی، ایثار، بلند نظری اور اُمنگ دب کر رہ جاتی ہے۔ جب کسی تعلیمی نظام کی بدولت نہ لوگوں کی بیکاری اور روزی کا مسئلہ حل ہو نہ تہذیب کا تحفظ ہو۔ نہ ان میں علمی کمال پیدا ہو، نہ سیرت کے بہترین جوہر نشوونما پائیں بلکہ محض ایک سطحی چمک اور بعض مضامین سے سرسری واقفیت حاصل ہو جائے، تو اس تعلیم کے حق میں کوئی کلمۂ خیر کس طرح کہا جا سکتا ہے؟

یہ سب اعتراضات ایک حد تک اور اپنی اپنی جگہ پر صحیح ہیں اور اس صورت حال کی ذمہ

---

[۱] سابق پرنسپل یونیورسٹی ٹریننگ کالج علی گڑھ

داری صرف مدرسوں اور استادوں ہی پر نہیں بلکہ والدین، اربابِ سیاست، ملکی حکومت وغیرہ سب پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن تعلیم کے سنجیدہ طالب علم کے لیے ان تمام متفرق خرابیوں کا جائزہ لینا کافی نہیں۔ اُسے یہ فکر ہونی چاہیے کہ ان سب کی اصل بنیادی وجہ معلوم کرے۔ ورنہ محض علامات تک توجہ کو منحصر رکھنا اور اصل مرض کی تشخیص نہ کرنا دانشمندی کا ثبوت نہیں۔ دراصل ہمیں دریافت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ تعلیم کیوں اس قدر بے روح اور بے اثر ہے اور طلبا کی زندگی میں کیوں کوئی پائدار اور دورس انقلاب پیدا نہیں کرتی۔

ممکن ہے کہ اس مسئلہ کے متعلق لوگوں میں بہت اختلاف رائے ہو اور یہ محض ممکن ہی نہیں لازمی ہے کیونکہ ان کی تشخیص کا انحصار ان کے مخصوص نقطہ نظر اور فلسفۂ زندگی پر ہوگا۔ لہٰذا مَیں اس مختصر مضمون کے ذریعے صرف یہ کرسکتا ہوں کہ اس بارے میں اپنا خیال بغیر زیادہ تفصیل اور توجہ کے بیان کردوں اور بس۔

تعلیم اور تمدنی زندگی میں ہمیشہ سے ایک نہایت گہرا اور قریبی تعلق رہا ہے۔ تاریخ تعلیم کا ہر باب اس صداقت کا شاہد ہے لیکن ہمارے مروجہ نظامِ تعلیم اور ہمارے قومی تمدن کا یہ رشتہ جو تعلیم کو زندگی اور حرکت بخشتا ہے بہت کمزور ہوگیا ہے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تقریباً ٹوٹ گیا ہے۔ اس کا ایک ثبوت تو بہت واضح ہے جس کی طرف آئے دن ماہرین تعلیم اور قومی سیاست کے رہنما بھی اشارہ کرتے رہتے ہیں یعنی یہ کہ ہمارے مروجہ نصاب تعلیم بلکہ اس کے پورے نظام کی بنیاد ہندوستان کے قومی تمدن اور اس کی مخصوص تہذیب اور روایات پر نہیں رکھی گئی بلکہ اس طریقہ تعلیم کو مستعار لے لیا گیا جو انیسویں صدی کے وسط میں انگلستان میں رائج تھا اور اس کو وقتاً فوقتاً مجبوری کی حالت میں رفو کرکے کام میں لایا گیا ہے۔ اس اعتراض کو بالفاظ دیگر اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس نظام تعلیم کی نشوونما وطن کی سرزمین میں نہیں ہوئی بلکہ یہ ایک غیر ملک کا پودا ہے، جو یہاں لایا گیا تھا، لیکن اسے یہاں کی آب وہوا راس نہیں آئی۔ بہرحال خواہ یہ الزام کسی حد تک صحیح بھی ہو اس بات کو ماننا پڑے گا کہ تعلیم کا ایک فرض یہ ضرور ہے کہ گزشتہ نسلوں نے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا جو سرمایہ چھوڑا ہے اس کو مناسب طریقے پر نئی نسلوں تک پہنچادے۔ اگر تعلیم نوجوانوں کی بڑھتی ہوئی قوتوں اور دل ودماغ کی نشوونما کے لیے قومی تہذیب کی غذا کا انتظام نہ کرے گی تو ان کی ذاتی فطرت اور قومی انفرادیت دونوں مسخ ہوکر رہ جائیں گی۔ مروجہ تعلیم کو اس بارے میں ناکامی ہوئی ہے۔ اس کے نتائج کا ایک نہایت

اثر آفریں نقشہ اقبال نے رموز بے خودی میں کھینچا ہے۔ جس میں ان نوجوانوں کی حالت دکھائی گئی ہے جن کی تعلیم نے ان کو قومی روایات سے باخبر اور بہرہ مند نہیں کیا۔

علمِ غیر آموختی اندوختی روئے خویش از غازہ اش افروختی

ارجمندی از شعارش مے بری می نہ وانم تو توئی یا دیگری

عقلِ تو زنجیریٔ افکارِ غیر در گلوئے تو نفس از تارِ غیر

بر زبانت گفتگو ہا مستعار دردِ دل تو آرزو ہا مستعار

لیکن اگر تعلیم اس فرض کو پوری کامیابی اور سلیقے کے ساتھ انجام دے اور قومی تہذیب وتمدن کا بیش بہا سرمایہ نئی نسلوں تک منتقل بھی کردے تو یہ کافی نہیں۔ کیونکہ وہ جن بچوں کی جسمانی اور دماغی نشوونما کر رہی ہے وہ ماضی کے زمانے میں زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ انہیں تو دورِ حاضرہ کے زندہ اور متحرک مسائل سے دوچار ہونا ہے۔ ان کے چاروں طرف آج کی زندگی ہے اور تعلیم کا ایک بہت اہم فرض یہ ہے کہ اس ہنگامہ خیز زمانے میں انہیں کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ زندگی بسر کرنا سکھائے۔ اور جس وقت مختلف قسم کے اثرات اور تحریکیں ان کو بیک وقت اپنی اپنی طرف کھینچیں وہ ان کی رہنمائی کر سکے۔ اگر تعلیم کی ساری سرگرمی ماضی کی تفسیر میں ختم ہو جائے اور اُسے حال کی ضروریات اور مسائل سے دلچسپی اور تعلق نہ ہو، تو وہ بالکل بے روح اور ناکارہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم میں ماضی اور اس کے تمدنی اور علمی کارناموں کی اہمیت زیادہ تر اسی وجہ سے ہے کہ اس سے موجودہ تمدن اور تہذیب اور انسان اور فطرت کے باہمی تعلقات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اگر ماضی حال کی تفسیر نہ کرے اور اس سے واقفیت حاصل کر کے ہم اپنے تمام موجودہ اداروں اور اجتماعی کوششوں کی قدروقیمت کو زیادہ اچھی طرح سے نہ پہچانیں اور اس کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے کوئی سبق نہ حاصل کریں، تو تعلیمی نقطہ نظر سے اس کی کوئی خاص اہمیت باقی نہیں رہتی۔ یقیناً بعض ماہرین علوم ایسے ہوں گے جو محض اپنے علمی تجسس اور شوقِ دریافت کی تشفی کے لیے ماضی کے آثار کا مطالعہ گہری نظر سے کریں گے لیکن اس چھوٹی سی جماعت کی خاطر ہم اسے عام لوگوں کی تعلیم کا جزو نہیں بنا سکتے۔ مروّجہ تعلیم کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ طلبہ کو موجودہ زندگی کے مسائل اور کشمکش سے ناواقف رکھتی ہے اور اکثروں کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا کر انہیں محض چند اصطلاحی مضامین یا ماضی کے بھولے بسرے افسانوں میں مگن رہنا سکھاتی ہے۔ سکولوں اور کالجوں کے

نصاب میں سے اکثر وہ اجزاء خارج کردیئے جاتے ہیں جن کا تعلق موجودہ مسائل اور معاملات سے ہوتا ہے اور عذر یہ کیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں مابہ النزاع ہیں۔ حالانکہ ہر زندہ اور اہم مسئلے کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس میں اختلاف اور بحث کی گنجائش ہو۔ مثلاً تاریخ کے نصاب کو اٹھا کر دیکھیے۔ بالعموم جہاں تک سکولوں کا تعلق ہے جنگ یورپ کے آغاز پر دنیا کی تاریخ ختم ہو جاتی ہے۔ اور بعض وضع دار سکول اور کالج ایسے بھی ہیں (ہندوستان میں بھی اور مغربی ممالک میں بھی) جہاں بیسویں صدی کو سرے سے سرزمین ممنوع سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ ہم جن معاشی اور سیاسی حالات میں آج زندگی بسر کر رہے ہیں، ان میں سے بیشتر یا تو جنگ عظیم کا نتیجہ ہیں یا کم از کم ان تحریکوں کا اثر ہیں جن کا پورا اظہار اس جنگ کے بعد ہوا ہے۔ موجودہ سیاسی اور معاشرتی رجحانات، فرد اور حکومت کی کشمکش، جماعتوں کی باہمی جنگ، بین الاقوامی تعلقات، ادب اور فلسفہ کی جدید تحریکوں کو سمجھنے اور ملکی سیاست میں دانشمندی کے ساتھ حصہ لینے کے لیے لازم ہے کہ نوجوانوں کی توجہ ان کی طرف مبذول کرائی جائے اور انہیں ان میں دلچسپی لینا اور سمجھ داری کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا سکھایا جائے۔ اس ضروری کام کو یہ کہہ کر ٹال دینا کہ تعلیم کو سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہیے یا اساتذہ کو تمام سماجی معاملات میں غیر جانبداری سے کام لینا چاہیے، انتہائی بزدلی اور بے وقوفی ہے۔ اگر تعلیم کا کوئی تعلق سیاست، معاشرت، مذہب وغیرہ سے نہ ہوگا، تو پھر تعلیم کا مقصد آخر کیا ہے؟ نوشت و خواند کی تعلیم؟ دماغ کی صوری (Formal) تربیت؟ حافظے کی مشق؟ لیکن یہ تمام چیزیں تو مقصود بالذات نہیں۔ یہ محض ذریعہ ہو سکتی ہیں کسی مقصد کے حصول کا اور مقصد کے تعین کے لیے ہمیں بہر حال زندگی اور اس کے زندہ مسائل کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

مگر معلم کے لیے محض ماضی اور حال کی فکر کافی نہیں۔ اسے مستقبل کی طرف بھی توجہ کرنا ہے اور ایک لحاظ سے یہ اس کے کام کا سب سے اہم حصہ ہے۔ زندگی اور اس کے تمام شعبوں اور اداروں میں انقلاب اور حرکت کی کارفرمائی ہے اور یہ انقلاب عالمِ فطرت اور فطرتِ انسانی دونوں کا خاصہ ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں سائنس کی ترقی کی وجہ سے انقلاب کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ جن بچوں کو ہم تعلیم دینا چاہتے ہیں انہیں آج نہیں کئی سال کے بعد زندگی کی عملی جدوجہد میں حصہ لینا ہے اور جب تک وہ اس میں شریک ہوں گے اس وقت تک دنیا بہت کچھ بدل چکی ہوگی۔ وہ محض ماضی کے وارث ہی نہیں بلکہ مستقبل کے تعمیر کرنے والے بھی ہیں۔ یہ بات بہت کچھ ان کی تعلیم کی نوعیت پر منحصر ہے کہ وہ کن اصولوں پر اپنے مستقبل کی تعمیر کریں گے۔ لہٰذا جہاں معلم کو ایک آنکھ ماضی اور حال پر رکھنی ضروری ہے وہاں دوسری سے

مستقبل کے امکانات کا جائزہ لینا بھی لازم ہے۔ اسے خود سوچنا اور سمجھنا ہے کہ موجودہ سیاسی، معاشرتی اور ذہنی تحریکوں کا رجحان کیا ہے؟ ان کا اثر آئندہ سماج پر کیا پڑے گا اور مستقبل کے لیے کس قسم کے سماج کی بنیاد ڈالنی چاہیے؟ مگر ہماری تعلیم اور معلموں نے اس طرف اب تک توجہ ہی نہیں کی۔ انہیں شاید اس امر کا احساس ہی نہیں کہ بغیر مستقبل کے معاشرے کا کوئی ذہنی تصور قائم کیے بچوں کی تعلیم بالکل ہوائی اور سطحی ہو کر رہ جاتی ہے۔ فلسفۂ تعلیم کے بہت سے اہم مسائل اس امر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ مثلاً فرد اور جماعت کا کیا تعلق ہے؟ ہم افراد کو جماعت کے اغراض کا آلہ کار بنانا چاہتے ہیں یا ان میں آزادیٔ رائے اور آزادیٔ عمل کی صلاحیت پیدا کر کے ایک متحرک سوسائٹی کی بنیاد ڈالنا، جس میں مسلسل تنقید اور بحث ومباحثہ کی گنجائش ہو۔ اگر جماعت فرد سے مقدم ہے، تو تعلیم کی ایک نوعیت ہوگی۔ اگر فرد کی اعلیٰ ترین تربیت تعلیم کا منتہائے نظر ہے اور جماعت اس مقصد کا ایک ذریعہ ہے، تو تعلیم کی نوعیت دوسری ہوگی۔ بہر حال یہ لازم ہے کہ تعلیم کی تنظیم میں ہم مستقبل کے امکانات کو نظر انداز نہ کریں بلکہ مدرسے کی زندگی اور درس وتدریس میں ان قدروں، اصولوں اور کام کرنے کے طریقوں کو رائج کریں، جنہیں ہم آئندہ سوسائٹی میں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ وہ اصول اور قدریں کیا ہوں گی۔ اس مضمون کا مقصد محض اس قدر ہے کہ معلموں کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کرائی جائے۔

لیکن ایک بات کو ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مستقبل پر زور دینے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں (اگر مدتوں اس کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے) کہ ہم تعلیم میں بچے کی موجودہ زندگی اور ذہنیت اور اُس کی جبلّتوں اور میلانات کو نظر انداز کر دیں۔ مستقبل کی تعمیر حال کے ہاتھ میں ہے۔ اور حال کے معنی ہیں بچے کی موجودہ زندگی اور اس کا موجودہ ماحول۔ ہمیں ان دونوں کو ڈھال کر اور ان کے امکانات سے پورا فائدہ اٹھا کر ایک بہتر دنیا اور بہتر زندگی کی تعمیر کرنی ہے جس میں آج کل کی مخالفتیں، کشمکش، محرومیاں اور بے انصافیاں نہ ہوں۔ لہٰذا حال کو ماضی اور مستقبل دونوں کا مقام اتصال سمجھ کر تعلیم کا مرکز بنانا لازم ہے۔

جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے　　وہ کل کے غمِ عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے　　وہ قوم نہیں لائقِ ہنگامۂ فردا

(اقبال)

دینی مدارس

عصری علوم کی تدریس اور حکومت سے اسناد کی منظوری کے حوالے سے

دینی مدارس کے وفاقوں کا متفقہ موقف

۱۔ اتحاد تنظیمات مدارس پاکستان کی رکن پانچوں تنظیمات کو ایکٹ آف پارلیمنٹ کے ذریعے 'تعلیمی بورڈز' کا درجہ دینا۔ یہ تنظیمات درج ذیل ہیں:

وفاق المدارس العربیہ، پاکستان — تنظیم المدارس اہل سنت، پاکستان

وفاق المدارس السّلفیہ، پاکستان — وفاق المدارس الشیعہ، پاکستان

رابطۃ المدارس الاسلامیہ، پاکستان

۲۔ دینی مدارس وجامعات وفاقی وصوبائی وزارتِ تعلیم کے ساتھ مربوط ہوں گے۔

۳۔ پاکستان میں قائم دینی مدارس وجامعات کو فعال رہنے کے لیے ان پانچوں تنظیمات میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق کرنا ہوگا۔

۴۔ پانچوں تنظیمات اپنا دینی نصاب طے کرنے کے لیے آزاد ہوں گی۔

۵۔ دستور پاکستان کے آرٹیکل ۲۵/اے کے تحت ریاست کی ذمے داری ہے کہ وہ پانچ سے سولہ سال کی عمر تک کے بچوں کے لیے یکساں اور مفت تعلیم کا بندوبست کرے اور اس کے لیے ضروری قانون سازی کرے۔ اس کا دائرہ وفاق کے زیر انتظام قبائلی علاقوں اور شمالی علاقہ جات تک محیط ہونا چاہیے اور یہ سب کے لیے یکساں طور پر عصری ودینی تعلیم پر مشتمل ہونا چاہیے۔

۶۔ اتحاد تنظیمات مدارس پاکستان کی رکن پانچوں تنظیمات درجہ ثانویہ عامہ (مساوی میٹرک) اور درجہ ثانویہ خاصہ (مساوی انٹرمیڈیٹ) تک اپنے نصاب میں لازمی عصری مضامین شامل کریں گی:

(الف) میٹرک کے لازمی مضامین یہ ہیں: ۱۔اردو ۲۔انگلش ۳۔اسلامیات ۴۔مطالعہ پاکستان ۵۔ریاضی۔نوٹ کمپیوٹر سائنس کی تعلیم اختیاری ہوگی۔

(ب) انٹرمیڈیٹ کی سطح کے لازمی مضامین یہ ہیں: ۱۔اردو ۲۔انگلش ۳۔اسلامیات ۴۔مطالعہ پاکستان۔

نوٹ: وزیرتعلیم محترم میاں بلیغ الرحمن صاحب کے زیرصدارت ایک اجلاس میں یہ طے کیا جاچکا ہے کہ دینی مدارس وجامعات کے طلبہ وطالبات پر اسلامیات لازمی کے مضمون کا اطلاق نہیں ہوگا، کیونکہ ان کی قابلیت اسلامیات میں مسلّم ہے۔

۷۔ نصاب، معیارِتعلیم اورامتحانات میں یکسانیت پیدا کرنے کے لیے عصری مضامین کی حدتک فیڈرل بورڈ آف سیکنڈری اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن کی منظور کردہ نصابی کتب کوتمام تنظیمات کے بورڈز اپنے نصاب کا حصہ بنائیں گے۔

۸۔ وفاقی یا صوبائی وزارتِ تعلیم پانچوں تنظیمات کی مجالس نصاب میں عصری مضامین کی حدتک اپنا ایک نمائندہ مقرر کرسکیں گی۔

۹۔ پانچوں تنظیمات کے نصاب مطبوعہ صورت میں دستیاب ہوں گے تاکہ تمام رکن تنظیمات کو ایک دوسرے کے نظام تعلیم کے بارے میں آگہی ہو اور حسب ضرورت ایک دوسرے کے تجربات سے تقابل اور استفادہ کرسکیں۔

۱۰۔ ہر تنظیم اپنے سند یافتگان/ ڈگری ہولڈر طلبہ وطالبات کا امتحانی اور اسناد کا ریکارڈ محفوظ رکھے گی اور ہر وقت برائے معائنہ دستیاب ہوگا۔

۱۱۔ غیرملکی طلبہ کے داخلے کے لیے وزارت تعلیم/ وزارت داخلہ کی تصریح (کلیئرنس) ضروری ہوگی۔

۱۲۔ پانچوں رکن تنظیمات کے ملحق مدارس، سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ء کی اضافی دفعہ ۲۱ (مجریہ ۲۰۰۵ء) کے تحت مندرجہ ذیل شرائط کے پابند ہوں گے:

(الف) کوئی مدرسہ/ جامعہ عسکری تعلیم وتربیت نہیں دے گا اور نہ ہی ایسا مواد رکھے گا۔

(ب) کوئی مدرسہ/ جامعہ نفرت انگیزی پر مبنی تعلیم نہیں دے گا، البتہ خالص اکیڈمک سطح پر تقابل ادیان، تقابل مذاہب اور علم الکلام کی تعلیم پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۱۳۔ وفاقی یا صوبائی حکومتیں دینی مدارس وجامعات کے بارے میں کوئی پالیسی مرتب کرتے وقت یا معلومات حاصل کرنے کے لیے اتحاد تنظیمات مدارس پاکستان کی رکن پانچوں تنظیمات کو اعتماد میں لیں گی۔

۱۴۔ پانچوں تنظیمات اپنے اپنے دائرہ کار میں وقتاً فوقتاً 'تدریب المعلمین' کے پروگرام مرتب کریں گی اور اس سلسلہ میں حسب ضرورت وفاقی وصوبائی وزارت تعلیم اور فیڈرل ایجوکیشن بورڈ سے فنی معاونت حاصل کرسکیں گی۔

نظام امتحانات

اتحاد تنظیمات مدارس کی رکن پانچوں تنظیمات حسب سابق اپنے امتحانات منعقد کریں گی۔ دینی مضامین کی طرح عصری مضامین کے پرچوں کی تیاری، امتحانات کا انعقاد اور پرچوں کی چیکنگ پانچوں تنظیمات اپنے اپنے نظام کے تحت کریں گی اور محکمہ تعلیم چاہے تو ان کا معائنہ کرسکتا ہے۔

اسناد کا اجرا

دینی وعصری مضامین کے درمیان نشانات (نمبرز) کا تناسب باہمی مشاورت سے طے ہوگا اور اسی کے مطابق تنظیمات اسناد کا اجرا کریں گی۔

نوٹ: درجہ عالیہ کی شہادہ (ڈگری) کو بی اے کے مساوی قرار دینے کے لیے ہائر ایجوکیشن کمیشن پہلے ہی اپنی پالیسی کا نوٹیفکیشن جاری کر چکا اور وہ یہ ہے:

۱۔ کسی بھی تنظیم کے درجہ عالیہ کی شہادت کا حامل (ڈگری ہولڈر) جب کسی بھی یونیورسٹی سے بی اے کی سطح کی انگریزی اور مطالعہ پاکستان کا امتحان پاس کرلے، تو اس کی ڈگری بی اے کے مساوی تسلیم کی جائے گی اور وہ ملازمت اور مقابلے کے امتحان میں شرکت کا اہل ہوگا۔

۲۔ پانچوں تنظیمات کی شہادۃ العالمیہ فی العلوم العربیۃ والاسلامیہ کی ڈگری کو 'ہائر ایجوکیشن کمیشن'، پہلے ہی ایم اے عربی واسلامیات کے مساوی تسلیم کر چکا ہے اور ہمارے کئی علماء پہلے ہی ملک کی مختلف یونیورسٹیوں سے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کر چکے ہیں اور بہت سے ان مراحل میں زیر تعلیم ہیں۔ لہٰذا اس کے لیے یہاں الگ سے کوئی عنوان

قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۳۔ جو مدارس عصری مضامین کی تدریس کے لیے حکومت کی اعانت چاہتے ہیں تو حکومت انہیں سرکاری معیار پر اساتذہ فراہم کرے، لیکن ان کے عزل ونصب (ہائر اینڈ فائر) کا اختیار متعلقہ ادارے کے پاس ہونا چاہیے۔

۴۔ اگر عصری مضامین کے لیے ہماری پانچوں تنظیمات کو با اختیار نہیں بنایا جاتا، ہماری اسناد کو قانونی حیثیت نہیں دی جاتی تو ہمارے طلبہ آزاد ہیں، پاکستان کے جس بورڈ سے چاہیں پورے مضامین کے امتحان دے کر میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کی اسناد حاصل کر سکتے ہیں اور پھر یہ ساری مشق بے سود رہے گی۔

دستخط ذمہ داران: مولانا مفتی منیب الرحمن مولانا قاری حنیف جالندھری

مولانا محمد یاسین ظفر مولانا عبدالمالک سید نیاز حسین نقوی

یہ سنّاٹا

جرم وہ ہے جسے مغرب جرم سمجھے اور اس کے اشارے پر اس کا میڈیا اور ہمارا غلام میڈیا اسے اچھالے جیسے ملالہ پر حملہ، پشاور آرمی سکول کے طلبہ کا بہیمانہ قتل، سلمان تاثیر اور مشال خان کا قتل۔ امریکیوں نے چند ہفتے پہلے قندوز میں سو حفاظ کو دستار بندی کے موقع پر شہید کر دیا (اس سے پہلے ڈمہ ڈولہ میں مدرسہ کے ۸۰ طلبہ شہید کیے)۔ اس پر ہر سو خاموشی ہے۔ ہمارے حکمران، ہمارا میڈیا، ہمارے متجددین اور انسانیت کے درد سے بے چین موم بتی مافیا... سب خاموش ہیں کیونکہ مغرب اسے اچھالنا نہیں چاہتا۔ یوں جیسے مدرسہ کے طلبہ انسان ہی نہیں ہوتے۔

اے اللہ! تیرا شکر ہے

شیخ سعدیؒ کہتے ہیں دجلہ کے کنارے ایک آدمی کو بھیڑیے نے زخمی کر دیا۔ دوا دارو کیا لیکن زخم بگڑ گئے۔ وہ آدمی اذیت سہتا رہتا اور الحمد للہ کہتا رہتا۔ ایک آدمی نے اس سے ایک دن کہا: تم اتنی تکلیف میں ہو ہر وقت اللہ کا شکر کس بات پر ادا کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا: اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مصیبت میں مبتلا ہوں معصیت میں نہیں۔

دینی مدارس ڈاکٹر محمد امین

دینی تعلیم کے وفاقوں کے متفقہ موقف پر البرہان کا تبصرہ

دینی مدارس ۔ منزل ہے کہاں تیری اے رہبرِ فرزانہ؟

وفاق خود کیوں دینی مدارس میں اصلاحات نہیں لاتے؟

دینی تعلیم کے وفاقوں نے اپنی ڈگریوں کی منظوری کے حوالے سے جو مشترکہ مطالبات حکومت پاکستان سے کیے ہیں اور عصری مضامین کی تدریس کے بارے میں جو متفقہ موقف اختیار کیا ہے اور جو ہم نے صفحات سابقہ میں طبع کر دیا ہے، ہم اصولی طور پر اس سے متفق ہیں.... لیکن اس کے باوجود ہمیں دینی مدارس سے بہت کچھ کہنا ہے۔ لیکن کچھ کہنے سے پہلے ہم اپنے اس موقف کا اعادہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم دینی مدارس کے حامی ہیں، انہیں پھلتا پھولتا دیکھنا چاہتے ہیں بلکہ ہم ان کی جدوجہد کو مزید موثر اور نتیجہ خیز دیکھنا چاہتے ہیں، اس لیے اگر ہم دینی مدارس کی خدمت میں کچھ ایسی تجاویز ان کے غور وفکر کے لیے پیش کریں جو ان کی موجودہ کوششوں سے کچھ مختلف ہوں، تو اس علمی اختلاف رائے کو ان پر تنقید یا ان کی تنقیص نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ دینی مدارس کے لیے ہمارے اخلاص اور محبت کی وجہ سے انہیں ہمدردانہ زیر غور لانا چاہیے۔

۲۔ اس تمہیدی گزارش کے بعد ہم عرض کرتے ہیں کہ جب دینی تعلیم کے سارے وفاق اس کے لیے تیار ہو گئے ہیں کہ وہ ثانویہ عامہ، ثانویہ خاصہ اور عالیہ میں عصری مضامین پڑھائیں تا کہ ان کے طلبہ کو ایسی اسناد مل سکیں جنہیں حکومتی ادارے میٹرک، ایف اے اور بی اے کے مساوی تسلیم کر لیں.... تا کہ دینی مدارس سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم معاشرے اور ریاست کے اداروں میں خدمات انجام دے سکیں اور وہ مضر تعلیمی ثنویت ختم ہو جائے جس کے منفی اثرات نے ہمارے معاشرے کو جکڑ رکھا ہے۔

اگرچہ دینی تعلیم کے کسی وفاق نے باقاعدہ تحریری طور پر اس کا اعلان نہیں کیا کہ اب وہ صرف مساجد اور مدارس کے لیے علماء تیار کرنے کی بجائے ایسے علماء تیار کریں گے جو مدارس ومساجد کے علاوہ معاشرے اور ریاست کے اداروں میں بھی کام کر سکیں، تاہم دینی مدارس

کے سارے وفاقوں کا متفقہ طور پر یہ تسلیم کر لینا کہ وہ ہر مرحلے پر عصری علوم پڑھانے کے لیے تیار ہیں لہٰذا ان کی اسناد کو حکومتی اسناد کے مساوی تسلیم کیا جائے... یہ امر بذات خود، بالواسطہ طور پر، اس امر کا اعلان ہے کہ دینی مدارس کے سارے وفاق یہ چاہتے ہیں کہ وہ عصری علوم پڑھائیں تا کہ ان کے طلبہ مدارس سے فراغت کے بعد زندگی کے سارے شعبوں میں خدمات انجام دے سکیں اور وہ مدارس و مساجد تک محدود نہ رہیں۔

ہم دینی مدارس کے اس موقف کی تائید و تحسین کرتے ہیں (کیونکہ یہی وہ مطالبہ ہے جو پچھلے پچیس تیس سال سے ہم ان سے کرتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ تعلیمی ثنویت کے اس بھنور سے نکلیں) لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے لیے انہیں حکومت کا کندھا کیوں درکار ہے؟ جب وہ عصری علوم پڑھانے پر تیار ہیں تو وہ خود اپنے طلبہ کو عصری علوم پڑھائیں اور ان کے طلبہ حکومتی امتحانات پاس کر کے حکومتی ڈگری لے لیں۔ میٹرک، ایف اے، بی اے تینوں سطحوں پر اس وقت ایسا انتظام موجود ہے کہ دینی مدارس کے طلبہ عربی اور اسلامیات لازمی و اختیاری؛ اور اردو و مطالعہ پاکستان جیسے آسان مضامین کے ساتھ دو تین عصری مضامین (خصوصاً عمرانی علوم میں سے جو علم اسلامیہ سے پہلے ہی مربوط ہیں) پڑھ لیں تو وہ آسانی سے حکومتی ڈگریاں لے سکتے ہیں۔

مشکل ایریا ہے تینوں سطحوں پر لازمی انگریزی اور میٹرک میں جنرل سائنس اور جنرل میتھ (ریاضی)۔ جہاں تک انگریزی کا تعلق ہے، ظاہر ہے یہ سب کے لیے لازمی نہیں ہونی چاہیے.... لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری رائے یہ بھی ہے کہ کوئی اور انگریزی پڑھے نہ پڑھے علماء کرام کو انگریزی ضرور پڑھنی چاہیے۔ اس کے دو بڑے فائدے ہیں: **ایک تو یہ کہ** اس وقت اسلام اور مسلمانوں کے سامنے جو سب سے بڑا علمی، فکری بلکہ عملی چیلنج ہے وہ ہے مغربی فکر و تہذیب کا اور اس کے علم بردار ممالک کا۔ اور علماء کرام جب تک انگریزی نہیں پڑھیں گے وہ نہ مغربی فکر و تہذیب کو براہ راست اس کے مآخذ سے سمجھ سکیں گے، نہ اسلام کو اعلیٰ علمی و فکری سطح پر اہل مغرب کی اپنی زبان میں پیش کر سکیں گے اور نہ مغربی اقوام کے ساتھ براہ راست ابلاغ کے قابل ہو سکیں گے۔ **دوسری بات یہ ہے کہ** ہمارا معاشرہ مغرب زدہ ہے خصوصاً اس کے حاکم بشمول سیاستدان، بیوروکریسی، فوج، عدلیہ اور دانشور وغیرہ۔ یہ لوگ علماء کرام کے بارے میں بڑی سطحی رائے رکھتے ہیں اور انہیں کنویں کا مینڈک سمجھتے ہیں جنہیں سوائے چند

دینیاتی مسائل کے اور کچھ نہیں آتا.... لہٰذا علماء کرام جب انگریزی پڑھیں گے، انگریزی بولیں گے، عصری مسائل سے واقف ہوں گے تو معاشرے کے ان بالادست طبقات کی رائے علماء کرام کے بارے میں بدلے گی۔ اس سے معاشرے میں علماء کرام کی توقیر اور ان کے معاشرتی مقام میں اضافہ ہوگا، ان میں خود اعتمادی بڑھے گی اور وہ دین کے لیے زیادہ موثر خدمات انجام دے سکیں گے۔

ان دو وجوہ کی بناء پر ہماری رائے یہ ہے کہ علماء کرام کو انگریزی ضروری پڑھنی چاہیے۔ جہاں تک میٹرک میں جنرل سائنس اور جنرل ریاضی کا تعلق ہے انہیں مجبوراً پڑھا جاسکتا ہے اور ویسے بھی یہ مضامین مفید ہیں مضر نہیں۔ ہاں! یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ کون سے بورڈ ان مضامین کا اردو میں امتحان لیتے ہیں تاکہ طلبہ میں ان کا فہم پیدا ہو اور انہیں انگریزی میں امتحان پاس کرنے کے لیے رٹّا نہ لگانا پڑے۔

٣۔ ہماری رائے یہ ہے کہ دینی مدارس خود عصری مضامین پڑھائیں اور خود ان کی نصابی کتب تیار کریں جو اسلامی تناظر میں مدون کی گئی ہوں۔ یہ بہت اہم ہے۔ دینی مدارس کے علم میں یہ بات ہونی چاہیے کہ ایچ ای سی ہو یا حکومتی بورڈ ہوں، یہ نصاب تجویز کرتے ہیں نہ کہ نصابی کتب۔ پھر حکومتی اور پرائیویٹ ادارے اس نصاب کے مطابق نصابی کتب تیار کرتے ہیں۔ ان نصابی کتب میں پابندی اس بات کی ہوتی ہے کہ حکومتی نصاب پڑھایا جائے لیکن اسلوب پر پابندی نہیں ہوتی۔ ہم ایک مثال کے ذریعے اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ مثلاً نصاب یہ ہے کہ طلبہ کو ریاضی میں جمع تفریق سکھائی جائے۔ اب جمع تفریق سکھانے والا سوال سود کا بھی ہوسکتا ہے اور زکوٰۃ کا بھی۔ یہ ہنر نصابی کتاب کے مولف کا ہے کہ وہ کون سا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح پابندی یہ ہے کہ حکومتی نصاب ضرور پڑھایا جائے لیکن اس پر پابندی نہیں ہے کہ حکومتی نصاب کے علاوہ آپ اس میں کچھ اضافہ نہیں کرسکتے۔

اس لیے انتہائی ضروری ہے کہ دینی مدارس جو عصری مضامین پڑھائیں، ان کی نصابی کتب وہ خود دینی تناظر میں مدون کریں اور جہاں ضروری ہو ان میں دینی معلومات کا اضافہ کریں اور وہ مغرب زدہ مصنفین کی تیار کردہ نصابی کتب نہ پڑھائیں جن میں مغربی فکر وتہذیب کا الحاد سرایت کیے ہوئے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ نوجوان اساتذہ کو بھرتی

کریں اور ان کی فنی اور نظریاتی تربیت کریں تا کہ گورنمنٹ کے یا مارکیٹ کے تیار کردہ مخدوش فکروعمل کے حامل اساتذہ لینے کی بجائے وہ ایسے اساتذہ خود تیار کریں جو انگریزی اور عصری مضامین پڑھائیں لیکن ان کا اپنا ذہن اسلامی ہو، ان کا طریق تدریس اسلامی ہو اور وہ طلبہ کو اچھا مسلمان بننے میں مدد دیں نہ کہ مغرب زدہ ذہن لے کر آئیں اور دینی مدارس کے طلبہ کو کنفیوز کریں اور دین پر ان کی یکسوئی میں خلل انداز ہوں۔

۴۔ ہم یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس کے وفاقوں کا رویہ حکومت کے ساتھ بڑا نرم ہے جسے بعض لوگ بزدلانہ اور فدویانہ سمجھتے ہیں۔ بعض حلقے الزام لگاتے ہیں کہ حکومت نے دینی مدارس کی قیادت پر باقاعدہ ''کام'' کیا ہے۔ بریلوی مکتب فکر کے وفاق کے سربراہ مفتی منیب الرحمن صاحب حکومتی رؤیت ہلال کمیٹی کے صدر ہیں۔ اہل حدیث وفاق کے سربراہ پروفیسر ساجد میر صاحب ایک دینی سیاسی جماعت کے سربراہ ہیں اور حکومت کے علی الاعلان حامی ہیں۔ دیوبندی وفاق کے ناظم اعلیٰ قاری حنیف جالندھری صاحب حکومتی اداروں میں عہدیدار رہے ہیں، بین الاقوامی اداروں سے فنڈز لیتے رہے ہیں اور ان کے مخالف انہیں 'حکومتی آدمی' قرار دیتے ہیں۔ پھر ہر حکومت کے سدابہار حامی مولانا فضل الرحمن صاحب کا دستِ شفقت بھی دیوبندی مدارس کے سر پر موجود ہے جنہیں بہت سے لوگ اسٹیبلشمنٹ کا آدمی سمجھتے ہیں۔ یوں بعض حلقوں کا خیال ہے کہ دینی مدارس کے وفاقوں کی تنظیم حکومت کی ایک ''پاکٹ تنظیم'' ہے جو فدویانہ انداز میں اپنے مطالبے پیش کرتی ہے اور پھر آسانی سے 'سابقہ تنخواہ' پر کام کرتی رہتی ہے اور خاموش ہو کر بیٹھ رہتی ہے جب تک کہ حکومت خود بیرونی دباؤ پر ان سے اپنے مطالبات منوانے کے لیے ان سے رابطہ نہیں کرتی اور گفت وشنید کا ڈول نہیں ڈالتی۔ لیکن دینی مدارس کے وفاقوں کی تنظیم خود کوئی اپنا ایجنڈا اور لائحہ عمل نہیں رکھتی اور نہ اس کے پاس اپنے مطالبات منوانے کے لیے کوئی حکمت عملی ہے۔

دینی مدارس اور وفاقوں کے جہاں دیدہ افراد کو ان الزامات پر بھی غور کرنا چاہیے.... تاہم ان باتوں سے قطع نظر ہماری رائے یہ ہے کہ دینی مدارس کو احساس ہونا چاہیے کہ وہ ایک بڑی قوت ہیں اور انہیں اپنے مطالبات دلیری سے حکومت سے منوانے چاہئیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ملک میں یہ روایت پڑ گئی ہے کہ حکومت معقول سے معقول مطالبہ بھی نہیں مانتی جب

تک احتجاج نہ کیا جائے، ریلیاں نہ نکالی جائیں، ہڑتالیں نہ کی جائیں بلکہ دھرنے نہ دیئے جائیں۔ دینی تعلیم کے وفاقوں کی قیادت کو یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے اور ایسا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے کہ وہ حکومت پر 'موثر دباؤ' ڈالے اور حکومت سے اپنے جائز مطالبات منوائے۔ دینی مدارس پُرامن رہیں لیکن اپنی بات حکمت اور قوت سے منوائیں۔

۵۔ اس وقت تک ہم نے وہ بات کی ہے جس میں ہمیں دینی مدارس کے وفاقوں سے اتفاق ہے۔ اب ہم دو ایسی باتوں کی طرف دینی تعلیم کے وفاقوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں جو بہت اہم ہیں اور جن میں وفاق بنیادی کردار ادا کرسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک مسئلہ تو ہے فرقہ واریت کا اور دینی تعلیم کے پانچ وفاقوں کی بجائے ایک وفاق بنانے کا اور دوسرا مسئلہ ہے طلبہ کے دینی مدارس میں داخلے سے پہلے کے مرحلے کی تعلیم کا۔

دیکھیے! سنجیدہ اور بزرگ علماء کرام میں سے کوئی اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ فرقہ واریت اور مسلک پرستی ہمارے معاشرے کا بہت بڑا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے ہر آدمی کا کوئی نہ کوئی فقہی اور کلامی مسلک ہوتا ہے اور یہ ہرگز کوئی عیب کی بات نہیں۔ لیکن اپنے مسلک کو دین بنالینا اور اسے دین جیسا تقدس دینا اور اسے مدارِ تحزب وتعصب اور معیارِ حق و باطل بنالینا اور دوسرے مسالک کو گمراہ قرار دینا، انہیں مٹانے کی کوشش کرنا اور انہیں نفرت وحقارت کا نشانہ بنانا، یہ بہرحال غلط ہے اور یہی فرقہ واریت اور مسلک پرستی ہے۔ اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ فرقہ واریت کا سبب اور مرکز دینی مدارس اور مساجد ہی ہیں۔ دینی مدارس میں فرقہ واریت والا ذہن تیار ہوتا ہے اور مساجد میں وہ بروئے کار آتا ہے۔

دینی مدارس سے فرقہ واریت کیسے کم اور ختم کی جائے؟ یہ انتہائی اہم سوال ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دینی مدارس کا نصاب بہتر بنایا جائے، طریق تدریس بدلا جائے، اساتذہ اور مہتمم حضرات کی غیر فرقہ وارانہ بنیادوں پر تربیت کی جائے.... وغیرہ۔ اس سلسلے میں کرنے کا ایک ضروری کام یہ ہے کہ دینی تعلیم کے وفاق مسالک کی بنیاد پر پانچ نہ ہوں بلکہ دینی تعلیم کا ایک ہی وفاق ہو اور ملک بھر میں اس کی شاخیں ہوں۔ اس میں صرف اہل تشیع کے لیے الگ سیکشن بنایا جاسکتا ہے۔ دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث اور جماعت اسلامی کا آسانی سے ایک 'نصاب' بنایا جاسکتا ہے البتہ یہ مسالک اس نصاب کے مطابق 'نصابی کتابیں' اپنی مرضی کی لگا

سکتے ہیں۔قرآن حکیم، حدیث، عربی زبان، فقہ واصول فقہ کا ان چاروں وفاقوں کا نصاب اس وقت بھی تقریباً یکساں ہی ہے۔قرآن حکیم کا ترجمہ وتفسیر اور حدیث کی بنیادی کتابیں سب کے ہاں یکساں ہیں۔فقہ میں ہدایہ بھی سب کے ہاں پڑھائی جاتی ہے۔عربی زبان کی تدریس میں ظاہر ہے مسلک کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔اس طرح اگر ایک وفاق بن جاتا ہے تو اس میں اتحاد امت اور ادب الخلاف کا مضمون بھی رکھا جاسکتا ہے۔فقہ میں مذاہب کا تقابلی مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے اور ایسے دیگر اقدامات بھی کیے جاسکتے ہیں جن سے فرقہ واریت کا جنّ کچھ قابو میں آجائے اور علماء کرام میں اتحاد و یکجہتی کی فضا پروان چڑھے۔

۶۔ وفاقوں نے اپنی مشترکہ یادداشت میں حکومت کو توجہ دلائی ہے کہ وہ دستور پاکستان کے مطابق میٹرک تک لازمی اور مفت تعلیم کا انتظام کرے اور اس کا نصاب عصری اور اسلامی علوم پر مشتمل ہونا چاہیے۔

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ پاکستانی حکومتوں نے پچھلے ستر (۷۰) سال میں جدید اور عصری تعلیم کو اسلامی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کے لیے کوئی سنجیدہ کاوش نہیں کی اور خوش فہمیوں سے باہر نکل کر اگر زمینی حقائق کو پیش نظر رکھا جائے تو آئندہ بھی اس کے امکانات نظر نہیں آتے۔لہٰذا دینی مدارس کی طرف سے محض ایک صحیح تجویز پیش کر دینا مسئلے کا حل نہیں بلکہ اس کا حل یہ ہے کہ سارے دینی مدارس اور وفاق مل کر حکومت پر دباؤ ڈالیں اور ان سے یہ کام کروائیں۔بصورت دیگر وہ معاشرے کی مدد سے یہ کام خود کریں۔جس طرح وہ معاشرے کی مدد سے دینی مدارس چلارہے ہیں اسی طرح سکولوں کا یہ نظام بھی وہ خود چلائیں۔اس کے لیے اگر سارے وفاق متحد ہوکر تحریک چلائیں تو معاشرہ ان کا ضرور ساتھ دے گا۔جس طرح دوسرے بہت سے گروپ اپنے مطالبات حکومت سے منواتے ہیں۔اسی طرح مدارس بھی تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے تحریک چلائیں تو وہ ان شاء اللہ کامیاب ہوگی۔تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنا اور مسلمان بچوں کی اسلامی تربیت کرنا کتنا اہم دینی فریضہ ہے، ہمیں علماء کرام کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔

امید ہے دینی مدارس اور وفاقوں کی قیادت سنجیدگی سے ہماری ان گزارشات پر غور کرے گی۔وآخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العلمین.

جدید تعلیم　　پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیم کا المیہ اور ایک استاد کا نوحہ

اگر حکومت یہ حکم دیتی کہ اساتذہ کرام انتظامیہ اور پولیس کی کاروائیوں اور کارکردگی پر نظر رکھیں۔ پولیس سٹیشنوں اور ضلعی و تحصیلی دفاتر پر چھاپے مار کر انتظامی اور امن وامان کے سلسلہ میں کی جانے والی غلط کاروائیوں کی حکومت کو اطلاع دیں تا کہ گُڈ گورننس کو یقینی بنایا جائے تو بات سمجھ میں آتی۔ لیکن عجیب اُلٹی بات ہوئی کہ حکومت نے ڈپٹی کمشنرز، اسسٹنٹ کمشنرز، تحصیل داروں اور پولیس کے اہل کاروں کی مدد سے تعلیمی کارکردگی بہتر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اور سول و پولیس افسروں کو حکم دیا ہے کہ وہ تعلیمی اداروں پر چھاپے ماریں، اساتذہ کی حاضری اور ان کی تدریسی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لئے حکومت کی مدد کریں اور اس طرح شعبہ تعلیم میں گُڈ گورننس کے حصول میں اپنا کردار ادا کریں۔ سبحان اللہ! کیا شاندار پالیسی ہے جو اپنائی جارہی ہے؟ اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ پولیس کی کاردکردگی مثالی ہے۔ امن وامان کے تمام مسائل حل ہو چکے، ملک میں ڈاکے چوریاں، قتل، بچوں اور عورتوں کے اغوا اور زیادتی قصہء پارینہ بن چکے، قبضہ گروپ ختم ہو گئے، بھتہ خوری ناپید ہو گئی، پولیس کے اہل کار جنید بغدادیؒ اور ابراہیمؒ اودھم کا روپ دھار چکے۔ دوسری طرف گاؤں کا پٹواری، قانون گو، گرداور، تحصیل دار اور ڈپٹی کمشنر حضرت عمرؓ کے دور کے مثالی اہل کار بن چکے۔ بس ایک شعبہ بچا ہے جہاں کارکردگی بدحال اور نظم وضبط خستہ حال ہے اور جس کی نگرانی اور اصلاح اب پولیس اور سول انتظامیہ کے گُرو کریں گے۔

ہمارا نصف صدی کا مشاہدہ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ یہی وہ سوچ اور عمل ہے جس کی وجہ سے شعبہء تعلیم بدحالی سے ہم کنار ہوا۔ یہ مانا کہ استاد نے بھی اپنا فرض ادا نہیں کیا اور اب تو وہ کسی صورت اپنا فرض ادا کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسے بے اختیار، بے وقار اور بے بس کر دیا گیا ہے۔ ایک تو ۱۹۷۱ء سے شروع ہونے والی سیاسی بدمعاشی کے نتیجے میں اساتذہ کی تعلیم وتربیت اور اُن کی میرٹ پر بھرتی کے نظام کو تباہ کر دیا گیا اور دوسری طرف ظالمانہ سیاسی مداخلت کی وجہ سے تعلیمی انتظامی ڈھانچہ ادھیڑ کر رکھ دیا گیا۔ سیاستدانوں اور افسر

شاہی نے محکمہ تعلیم کو چراگاہ بنالیا۔ اب اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ملک کے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں نصاب سازی، درسی کتب کی اشاعت اور تقسیم کاری، تربیت اساتذہ، اعلیٰ و ثانوی بورڈز کے امتحانات کی سربراہی اور شعبۂ تعلیم کے تمام ترقیاتی پراجیکٹس سِول بیوروکریسی کے ہاتھ میں ہیں۔ محکمہ کا سربراہ پاکستان ایڈمنسٹریٹو سروس کا سینئر رکن ہوتا ہے۔ یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے دیگر اداروں کے سربراہوں کا تقرر بیوروکریسی کرتی ہے۔ سکولوں میں اساتذہ کی حاضری یقینی بنانے کے لیے ریٹائرڈ حوالداروں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں جو پی ایم ایس کے گریڈ ۱۸ کے افسر جو ڈسٹرکٹ مانیٹرنگ آفیسر کہلاتا ہے، کے ماتحت کام کرتے ہیں۔ ضلعی سطح پر اساتذہ کی بھرتی ڈپٹی کمشنر کرتا ہے۔ اس طرح شعبۂ تعلیم کا ایک ایک عضو پوری طرح بیوروکریسی کے شکنجے میں ہے۔ سکول، کالج کا سربراہ بالکل بے اختیار ہے اور ٹیچر کے پاس چاک پکڑنے اور بلیک بورڈ پر لکھنے کے اختیار کے علاوہ کوئی اختیار نہیں ہے۔ استاد کا بچہ بیمار ہو، بوڑھے والدین کی دوائی لینا ہو یا کسی قریبی عزیز کے جنازے میں شرکت کرنا ہو اور اُسے چھٹی درکار ہو تو وہ گڑگڑاتا بھی رہے تو بیچارہ ہیڈ ماسٹر کیا کرے؟ اُسے تو چھٹی یا چھٹیاں دینے کا اختیار ہی نہیں۔

وہ جس نے نئی نسل کو شاہبازی کا سبق دینا تھا وہ خود گُربہ مسکین کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ نئی نسل کو عزت و وقار کا احساس وہی عطا کر سکتا ہے جس کا اپنی بھی کوئی عزت و وقار ہو۔ تعلیم اعداد و حروف پڑھانے کا نام نہیں، تعلیم تو شخصیت اور انسانیت پروان چڑھانے کا نام ہے اور یہ نازک کام ہے جو عزم و ہمت کی حامل اعلیٰ شخصیات ہی سرانجام دے سکتی ہیں۔ قوم کیوں سرخمیدہ ہو چکی اور نئی نسل میں سربلندی کے نشان کیوں مٹ چکے؟ صرف اور صرف اس لیے کہ اس ملک میں علم اور اہل علم کو بے وقار کر دیا گیا ہے۔ اساتذہ کو سربلندی کی بجائے سرخمیدہ ہونے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔

موجودہ صورت حال میں جتنے مرضی تعلیمی مداخلات (Educational Inputs) کا انتظام کریں، جتنے مرضی پیف سکالرشپس کا اہتمام کر دیں، جتنے مرضی پولیس اور انتظامی اہل کاروں کے چھاپوں کا انتظام کر دیں، اور جتنے مرضی مانیٹرنگ سَیل بنالیں تعلیم کا مسئلہ بہتر ہونے والا نہیں۔ نہ انرولمنٹ بڑھے گی، نہ ڈراپ آؤٹ ریٹ کم ہوگا، نہ معیارِ تعلیم میں بہتری آئے گی اور نہ قوم کو اعلیٰ کردار کے انسان ملیں گے۔ ہاں! بورڈز کے امتحانوں میں طلبہ کے

حاصل کردہ نمبر شاید ۱۰۰ فیصد ہو جائیں اور یونیورسٹیوں میں گریجویٹس کے سی جی پی اے ۴ میں سے پورے ۴ ہو جائیں لیکن سی ایس ایس کے امتحان میں کامیابی کا تناسب 2 فیصد ہی رہے گا اس لئے کہ تعلیم تو ہو نہیں رہی صرف امتحان ہو رہے ہیں اور اعلیٰ گریڈز آ رہے ہیں۔ پہلے نالائق پروفیسروں کی چیئرمینی سے پھر بھی امتحانی بورڈز کا کچھ بھرم باقی تھا۔ اب کمشنروں کی چیئرمینی سے امتحانوں کی جو بھد اُڑے گی اس کا فی الحال تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن تصور کرنا ضروری بھی نہیں ہے کیونکہ کمشنروں کی انتظامی دہشت کی وجہ سے کوئی امتحانی بداعتدالی کی خبر باہر نہیں آئے گی۔

ان خرابیوں کا حل کیا ہے؟

فی الحال ان خرابیوں کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر اس کا کوئی اصولی حل ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ تعلیم، اہل تعلیم کے سپرد کر دی جائے۔ لیکن اس کے لیے پہلے اہل تعلیم کی نسل پروان چڑھانا ہو گی جو اس وقت تقریباً ناپید ہے۔ تربیت اساتذہ کو دوبارہ پرانی قدروں پر استوار کرنا ہو گا۔ تعلیمی انتظامی ڈھانچہ کی اوور ہالنگ کرنا ہو گی۔ پولیٹیکل اور بیوروکریٹک مداخلت ختم کرنا ہو گی۔ صوبائی سطح سے کلاس روم کی سطح تک استاد کو بااختیار اور باوقار بنانا ہو گا۔ شعبۂ تعلیم سے مالی مفادات کی بیخ کنی کرنا ہو گی۔ اخلاق، کردار، خلوص اور محبت کو قدر و قیمت دینا ہو گی۔ علم اور اہل علم کو وقار بخشنا ہو گا۔ یہ اتنے مشکل کام جو ہم نے گنوائے ہیں موجودہ ہیئت مقتدرہ سے تو ہونا مشکل ہیں۔ اور اس مشکل کام پر آج ہاتھ ڈالا بھی جائے تو جسدِ تعلیم کی صحت مندی میں کم از کم 25 سال لگیں گے۔ لیکن قوموں کی زندگی میں 25 سال کچھ بھی نہیں ہوتے۔ اگر اس قوم نے تعلیم کو تباہ کرنے میں ۱۹۷۱ء سے اب تک تقریباً نصف صدی لگائی ہے تو تعمیر میں اگر ربع صدی لگ بھی جائے تو یہ خسارے کا سودا تو نہیں۔

تقویٰ کی پلاننگ

ہم نے ایک ہمسائے سے پوچھا تم شب برأت (۱۵ شعبان) پر حلوہ کیوں بانٹتے ہو؟ اس نے کندھے اچکا دیے۔ بچوں سے پوچھا تم پٹاخے کیوں چلاتے ہو؟ انہیں بھی پتہ نہ تھا کہ وہ یہ استقبال رمضان کے لیے کرتے ہیں، وہ رمضان جو تقویٰ کا مہینہ ہے۔ رمضان آنے والا ہے۔ کیا آپ نے اس مہینے سے تقویٰ حاصل کرنے کی کوئی پلاننگ کی ہے؟

اسلام اور پاکستان مدیر

مغرب زدہ مسلم ممالک کے علماء کا پاکستان پر ثقافتی حملہ

۲۲ مارچ ۲۰۱۸ء کو مصر کے مفتئ اعظم جناب شوقی محمد ابراہیم عبدالکریم اور ان کے وفد نے جنابِ صدرِ مملکت سے ملاقات کی جہاں انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف علماء کرام کی جدوجہد پر بات ہوئی۔ اسی روز مفتئ اعظم مصر نے اسلامی نظریاتی کونسل کے ایک اجلاس میں بحیثیت مہمانِ خصوصی بھی شرکت کی جہاں ’پیغام پاکستان‘ کے عنوان سے ادارہ تحقیقات اسلامی (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی) کے محققین کی طرف سے تیارہ کردہ اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان اور دینی مدارس کے بعض علماء کے حمایت کردہ قومی بیانیے یا فتوی کی تحسین کی گئی۔

پچھلے دنوں امام کعبہ جناب ڈاکٹر الشیخ صالح بن محمد آل طالب بھی تشریف لائے اور انہوں نے وزیر اعظم اور صدر مملکت سے ملاقات فرمائی اور وہ ملک کے کئی اہم دینی اداروں اور مدارس وجامعات میں بھی گئے اور کئی کانفرنسوں سے خطاب کیا۔ مارچ ۲۰۱۸ء کے آخری ہفتے میں ’’پیغامِ پاکستان‘‘ کے حوالے سے ایک کانفرنس کراچی میں ہوئی جس کی روح رواں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی تھے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارہ تحقیقات اسلامی جیسے سرکاری اداروں سے اپنی مرضی کا بیانیہ لینے کے لیے ان دونوں کی سربراہی ایسے افراد کے سپرد کی گئی جو یا تو اس کے اہل نہیں تھے یا ایسے افراد چنے گئے جو مغرب پرست تھے اور حکومت کی مغرب پرستانہ پالیسیوں کو شرعی جواز مہیا کرنے پر آسانی سے آمادہ ہو سکتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ اس ساری سرگرمی کے پیچھے کون ہے اور اس کا مقصد کیا ہے؟ کون ہے جو یہ چاہتا ہے کہ پاکستان کے علماء کرام اور دینی سکالرز عالم کفر کے سردار امریکہ اور اس کے ہم نواؤں کی تو مذمت نہ کریں جو عالم اسلام میں اور خصوصاً پاکستان میں دہشت گردی کا ذمہ دار ہے۔ اور وہ امریکہ ومغرب کے ایجنٹ اِن مسلم حکمرانوں کی بھی مذمت نہ کریں جو مسلم معاشروں (اور خصوصاً پاکستان میں) شریعت نافذ نہ کرنے پر مُصر ہیں۔ لیکن وہ اسلام کی ایسی تشریح کی حمایت پر اصرار کریں جس سے اسلام کو مذہبِ گوسفنداں ثابت کیا جا سکے، جس میں نہی عن المنکر کا کوئی کردار نہ ہو اور جس میں شریعت اسلامی کے نفاذ اور مغرب کی الحادی فکر وتہذیب (سیکولرزم، لبرل ازم، لادین جمہوریت اور نظام سرمایہ داراری) کے ردّ پر اصرار نہ ہو۔

اسلام اور پاکستان　　مدیر

اسلامی پاکستان کا ایک اُبھرتا ہوا مسئلہ۔سیکولر عدلیہ

پاکستان میں سیاسی جماعتیں (پیپلز پارٹی، مسلم لیگ، تحریک انصاف، نیشنل عوامی پارٹی...وغیرہ) اور سول وخاکی بیوروکریسی تو سیکولر تھیں ہی، آج کا ابھرتا ہوا مسئلہ یہ ہے کہ ہماری عدلیہ کا سیکولر چہرہ بھی نمایاں ہو کر سامنے آ گیا ہے۔

ہمیں یہ بات اس لیے کہنا پڑی کہ پچھلے ہفتے ہماری عدالتوں نے تحریک لبیک کی قیادت کے خلاف دہشت گردی کے کئی مقدمات درج کیے، عدالت عظمٰی نے اس کے خلاف سوموٹو ایکشن لیا اور تحریکی قیادت کے گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے ہیں۔اس پر ہمیں شیخ سعدیؒ کی وہ بات یاد آتی ہے کہ یہ عجیب لوگ ہیں جنہوں نے کتے کھلے چھوڑے ہوئے ہیں اور پتھر باندھ رکھے ہیں۔مطلب یہ کہ حکومت نے ختم نبوت کے حساس مسئلے میں نقب لگائی، کروڑوں مسلمانوں کے دل مجروح ہوئے لیکن یہ 'بنیادی حقوق' کا مسئلہ نہیں بنا۔اس پر کوئی سوموٹو نہیں لیا گیا۔حکمرانوں پر دہشت گردی کا مقدمہ نہیں بنایا گیا۔علماء نے اس پر توجہ دلائی، شور کیا، احتجاج کیا لیکن نہ حکومت ٹس سے مس ہوئی اور نہ عدالت، تنگ آ کر کچھ لوگوں نے دھرنا دے دیا۔پھر بھی حکومت نے ان کی بات نہ مانی۔ یہاں تک کہ خون خرابہ ہوا اور ہنگامے سارے ملک میں پھیل گئے تو سیکورٹی ادارے حرکت میں آئے اور انہوں نے صلح صفائی سے ہنگامے ختم کرائے۔ذرا دھول بیٹھی تو اب عدالتوں نے دھرنا دینے والوں کے خلاف دہشت گردی کے پرچے کٹوا دیے ہیں اور اس کی قیادت کو گرفتار کر کے سزا دینے کی باتیں ہو رہی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ یہ عدل کی کون سی قسم ہے؟ کہ آپ برے عمل کو نہیں روکتے لیکن جب اس کا ردعمل ہوتا ہے تو آپ 'انصاف' کی دہائی دینے لگتے ہیں۔اور یہ کوئی آج کی بات نہیں، کوئی ایک واقعہ نہیں۔ یہ سپریم کورٹ اس سے پہلے قرارداد مقاصد کے آئین پر حاوی نہ ہونے کا غیر اسلامی فیصلہ دے چکی ہے۔سرحد میں ایم ایم کے نفاذ شریعت بل (حِسبہ بِل) پر اس نے عمل نہیں ہونے دیا۔پچھلے سال اس سپریم کورٹ نے ان امور کے بارے میں فیصلہ دیا جن کو پارلیمنٹ نہیں چھیڑ سکتی اور ان میں آئین کے اسلامی کردار کو شامل نہ کیا۔۱۹۷۹ء سے حدود قوانین ملک کے قانونی ڈھانچے کا حصہ ہیں لیکن یہ عدالتیں ان پر عمل نہیں کراتیں۔فحاشی وعریانی کے خلاف، سود کے خلاف، نظام تعلیم میں انگریزی کے غلبے کے

خلاف مقدمات سپریم کورٹ میں دائر ہیں لیکن سپریم کورٹ حرکت میں نہیں آتی۔ شاتمِ رسول کے قاتل کو سزائے موت دینا صریحاً خلافِ سنت ہے، اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خلاف ورزی ہے (اور بالواسطہ خدا و رسول اور قرآن وسنت کے نفاذ سے انکار اور ان کی توہین ہے) لیکن ہماری عدالت عظمیٰ کے محترم ججوں کو یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ وہ شرعی علوم میں مہارت نہیں رکھتے [کیوں نہیں رکھتے؟ اس پر کون سوچے گا؟] ممتاز قادری (شہیدؒ) کو پھانسی پر لٹکانے کی بڑی جلدی تھی لیکن کافرہ شاتمۂ رسول (آسیہ مسیح) جو اپنے جرم کا اقرار کر چکی اور عدالت میں جس کا جرم ثابت ہو چکا اور جس کی وجہ سے سلمان تاثیر اور ممتاز قادری شہیدؒ والا واقعہ پیش آیا، وہ زندہ ہے لیکن کسی اعلیٰ عدالت کو اس کے خلاف اپیل سننے کی کوئی جلدی نہیں۔

ہماری عدلیہ ایک دن میں سیکولر نہیں ہوگئی، اس میں ستّر برس لگے ہیں۔ اس کی ذمہ دار ہماری حکومت ہے، خود عدلیہ ہے اور سب سے بڑھ کر اس کے ذمہ دار ہمارے علماء کرام اور ہماری دینی جماعتیں ہیں جن کا تصورِ دین اور نفاذِ دین کی حکمتِ عملی ناقص ہے۔ تبلیغی جماعت کے کروڑوں افراد لوگوں کے کلمے سیدھے کرا رہے ہیں، دینی مدارس گردانوں کے رٹے لگوا رہے ہیں۔ دینی سیاسی جماعتیں اسمبلی میں چند نشستوں کے لیے پاگل ہو رہی ہیں۔ کسی کو ہوش نہیں کہ ملک میں ایک 'شریعہ ولاء کالج' ہی قائم کر دیں تا کہ ایسے وکلاء اور جج تیار ہو سکیں جو جدید قانون کے ساتھ شریعت اسلامی کے بھی ماہر ہوں اور جن کی تربیت ایسی ہوئی ہو کہ وہ اسلامی قانون کے نفاذ اور اس پر عمل کے علمبردار ہوں۔ ایک جیوڈیشل اکیڈمی ہی قائم کر دیں جس میں موجودہ وکلاء اور ججوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کا انتظام ہو۔

دینی لوگو! بہت کچھ بگڑ چکا۔ اب ہی عقل سے کام لو۔ نظام تعلیم وتریت کی اصلاح کے لیے اٹھو ورنہ تمہارا حشر وہی ہوگا جو مصر میں الاخوان المسلمون (اور صدر مرسی) کا ہوا کہ سیکولر عدلیہ اور سیکولر فوج نے مل کر، امریکی شہ پر، اکثریتی ووٹ حاصل کرنے والی اسلامی جماعت کا تختہ الٹ دیا۔ پاکستان میں دینی سیاسی جماعتوں کا (ان کی اپنی حرکتوں، غلط پالیسیوں، فرقہ واریت، باہمی انتشار اور متفقہ لائحہ عمل نہ ہونے کی وجہ سے) اقتدار میں آنے کا امکان دور دور تک نظر نہیں آتا.... لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر ایسا ہو بھی جائے تو مغرب زدہ اور سیکولر عدلیہ اور فوج انہیں حکومت نہیں کرنے دیں گی.... دینی قوتوں میں سے کوئی ہے جو ان باتوں پر سوچے؟ فاعتبروا یا اولی الابصار.

اسلام اور پاکستان

پروفیسر عاصم حفیظ

'عورت راج آرہا ہے'

یوم خواتین کے موقع پر کچھ تصاویر دیکھیں جن میں چند ماڈرن خواتین سڑکوں پر سائیکلیں لے کر مارچ کر رہی ہیں۔ 'میرا جسم۔ میری مرضی' کا نعرہ اب پرانا ہوا۔ اس ریلی کا نعرہ تھا 'میری سڑک۔ میری مرضی'۔ 'میرا شہر۔ میری سڑکیں'۔ ایک سائیکل بردار خاتون نے اپنی کمر پر پلے کارڈ لٹکا رہا تھا کہ ''راستہ دیجیے! عورت راج آرہا ہے''۔ جی ہاں: ارض پاک کی سڑکوں پر یہ عورت راج خوب سج دھج سے نکلا۔ اس سائیکل ریلی کی ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ سب کے پاس نئی نویلی سائیکلیں تھیں، اتنی نئی نویلی کہ ان کے پلاسٹک کور بھی نہیں اترے تھے۔ یعنی کسی نے ابھی ابھی اسی مقصد کے لئے خریدی تھیں یا پھر شائد اس ریلی کی شاندار نمائش کے بعد واپس دکاندار کو ہی واپس دے دینی تھیں۔ یہ تو ثابت ہوا کہ سڑکوں پر سائیکل چلانے کا حق مانگنے والی یہ خواتین روز سائیکل چلانے والی نہیں ہیں۔ انہیں تو بس چند لمحوں کے لئے سائیکل بردار بننا تھا اور تھمائے گئے پوسٹرز کو لہرانا تھا تاکہ ''عورت راج'' لایا جا سکے۔

ارضِ وطن کو این جی اوز کی یلغار کا سامنا ہے جو مختلف نان ایشوز کو لے کر اپنا ایجنڈا پورا کرنا چاہتی ہیں۔ اب خوب بحث ہوگی کہ عورت کیوں سائیکل نہیں چلا سکتی؟ سڑکوں پر اس کا حق کیوں نہیں ہے؟ اسے قید کیوں کیا جاتا ہے؟.... وغیرہ وغیرہ۔ یعنی معاشرے کو ایک نیا موضوع فراہم کیا جائے گا۔ ویسے پنجاب حکومت کے زیر انتظام خواتین کو موٹر سائیکل مفت اور آسان قسطوں پر فراہم کرنے کا منصوبہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ مقصد ایک ہی ہے کہ سڑکوں کو وجودِ زن سے رنگین بنایا جائے۔ یہ ماڈرن خواتین کبھی معاشرے میں عورت کے حقیقی مسائل پر بات نہیں کرتیں۔ کبھی بیماری، غربت، بھوک سے پریشان خواتین کی بات نہیں کرتیں بلکہ سڑکوں پر سائیکل چلا کر عورت راج لانے کا اعلان کرتی ہیں۔ جس طرح ان خواتین کے پاس سائیکلیں اپنی نہیں بلکہ نئی نویلی کسی این جی او نے فراہم کیں تھیں، اسی طرح ان کے ایشوز بھی مغرب میں بیٹھے کوئی منصوبہ ساز ترتیب دیتے ہیں۔ یہ بیچاری تو چند لمحات کی ایکٹنگ کا ثمر وصول کرتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ اس طرح ''عورت راج'' لا رہی ہیں۔ ہمارے معاشرے کی اکثریت کے لیے یہ سب انجان حرکتیں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ تماشے ہر روز بپا کیے جا رہے ہیں۔ کاش کوئی سوچے کہ معاشرے کو نقب لگانے والے یہ حلقے کتنے نقصان دہ ہیں!

اسلام اور پاکستان پروفیسر ملک محمد حسین

پاکستان میں انتخابی معرکہ
کیا دینی سیاسی جماعتوں کا کوئی مستقبل ہے؟

اب چند ماہ کے اندر اندر قومی انتخابات کا معرکہ برپا ہونے والا ہے۔ بعض سیاسی جماعتیں منصوبہ بندی میں مصروف ہیں جب کہ بعض دیگر جماعتوں نے ہلکی پھلکی انتخابی مہم بھی شروع کردی ہے۔ دینی سیاسی جماعتیں بھی جواب دینی کم اور سیاسی زیادہ ہوگئی ہیں معرکہ میں اُترنے کے لیے بے تاب ہیں۔ متحدہ مجلس عمل کا احیاء اور جماعت اسلامی کی اس میں شمولیت مولانا فضل الرحمن کی سیاسی ذہانت کا شاہکار اقدام ہے۔ پاکستان میں مولانا اب اسلامی سیاسی تحریک کے قائد بنتے نظر آرہے ہیں۔ جماعتِ اسلامی نے بھی اپنے اندرونی حلقوں میں الیکشن کی تیاری کا سگنل دے دیا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ جماعت اسلامی آئندہ الیکشن میں قومی اسمبلی کی 82 سیٹوں پر الیکشن لڑے گی اور اسی تناسب سے صوبائی اسمبلیوں کے لئے بھی افراد کھڑے کیے جائیں گے۔ متحدہ مجلس عمل کے احیاء کے بعد کیا صورت ہوگی اس کا ابھی انتظار ہے۔ دیگر مسلکی سیاسی جماعتیں بھی یقینا سوچ بچار کر رہی ہوں گی۔ محترم ڈاکٹر طاہر القادری کی عوامی تحریک بھی یقینا اندرونی حلقوں میں متحرک ہوگی لیکن اپنے قائد محترم کے عمومی طور پر کینیڈا اور دیگر غیر ممالک میں قیام کی وجہ سے شاید ابھی اُن کی سرگرمیاں زیادہ ظاہر نہیں ہو رہیں۔ تحریک لبیک اور ملی مسلم لیگ کے نام سے نئے مذہبی گروہ بھی انتخابی اکھاڑے میں اتارے جارہے ہیں۔

وطنِ عزیز میں دینی سیاسی جماعتوں کی الیکشن پرفارمنس کبھی زیادہ قابل توجہ نہیں رہی سوائے ۲۰۰۲ء کے الیکشن میں جب ایم ایم اے نے قابل لحاظ نشستیں جیتی تھیں۔ صوبہ خیبر پختون خواہ میں حکومت بھی بنائی لیکن قابل تقلید گڈ گورننس کا کوئی خاطر خواہ نمونہ پیش نہیں کر پائے۔ جمعیت علماء اسلام اپنے وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مدارس، تبلیغی جماعت کی خاموش پشت پناہی اور علماء کرام کے وسیع نیٹ ورک کی وجہ سے اتنی نشستیں حاصل کر لیتی ہے کہ حکومت بنانے والی اکثریتی پارٹی کو اُن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور مولانا فضل الرحمن بھی

اپنی سیاسی ذہانت اور بصیرت کی وجہ سے اپنی پارٹی کی جسامت سے زیادہ حصہ وصول کر لیتے ہیں۔مولانا اب آہستہ آہستہ اپنا بین الاقوامی پوسچر بھی پسندیدہ اور مؤثر بنانے میں کامیاب ہوتے نظر آرہے ہیں۔اُن کے حالیہ پانچ نکات بین الاقوامی سیاست کے اچھے فہم کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ایم ایم اے کے احیاء کی وجہ سے مولانا فضل الرحمن کی سیاسی قوت میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔جماعت اسلامی اور دیگر دینی سیاسی قوتیں مولانا کے سایہ عاطفت کی وجہ سے عہد طفولیت میں واپس چلی گئی ہیں۔ہاں! شاید بعض راہنماؤں کو قومی اسمبلی میں پہنچنے کا موقع مل جائے۔

جماعت اسلامی ابھی تک ردِعمل کی سیاست سے باہر نہیں آپا رہی۔کارکنوں کی تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے لیکن منفی تنقیدی رجحان اور ردِعمل کے رویے ہی غالب نظر آتے ہیں۔الیکشن کے لیے ٹھنڈے دل سے صورتِ حال کا تجزیہ ضروری ہوتا ہے اور گراس روٹ لیول پر افراد اور گروہوں کی سوچ کے دھاروں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔اسلامی انقلاب کی اصطلاح اب جہاں معنوی طور پر دھندلا چکی ہے وہاں اس کی دلکشی بھی قائم نہیں رہی۔ایران کے اسلامی انقلاب نے بھی، جو بعد میں شیعہ انقلاب میں ڈھل گیا، اثر دکھایا ہے۔طالبان، القاعدہ اور داعش کے ظہور نے بھی اسلامی انقلاب کو دھندلانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے، حالیہ دنوں میں سعودی عرب کے ولی عہد شہزادہ محمد بن سلیمان کے اس بیان نے کہ سرد جنگ کے زمانے میں مغرب نے اسلام اور مسلمانوں کو اشتراکیت کے خلاف استعمال کیا اور اسلام کا سخت گیر چہرہ پیش کیا گیا اور اب ماڈریٹ اسلام کو آگے بڑھایا جائے گا، بھی اسلام کی سیاسی حیثیت اور اسلامی نظام کے نعرے کو نقصان پہنچایا ہے۔لہٰذا انتخابی سیاست میں اب ایک نئی سوچ اور نئی حکمت عملی پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔سیاسی اتحاد، سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے طریقے اور اسی طرح کے پرانے ہتھکنڈے کم از کم دینی سیاسی جماعتوں کے لیے بے کار ہیں۔ہاں ان طریقوں سے چند ایک ایسے لیڈرز مستفید ہو سکتے ہیں جو دینی سیاسی جماعتوں کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ظاہر ہے اس سے کوئی تبدیلی تو نہیں آئے گی اور اگر آئے گی بھی تو دینی سیاسی حلقوں کے قائدین کی سوچ میں آئے گی جو اپنے آپ کو قابلِ قبول بنانے کے لیے وہ اختیار کریں گے۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد ہم پاکستان میں الیکشن کی سماجی اور نفسیاتی کیفیت کا ذکر کریں

گے جو ہماری ذتی رائے اور تجربے کا حاصل ہے۔سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ کسی امیدوار کو ووٹ کس بنیاد پر ملتے ہیں؟

۱۔ پارٹی کی بنیاد پر

جس پارٹی کا حجم بڑا ہو،جس پارٹی کا پروپیگنڈا زیادہ ہو،جس پارٹی کا عوام میں امیج اچھا ہو،جس پارٹی کے پاس مضبوط امیدوار ہوں،جس پارٹی کی عوام میں جڑیں ہوں،جس پارٹی کے پاس مخلص ورکرز ہوں،جس پارٹی کے پاس مفاد یافتہ ورکرز کی بڑی تعداد ہو،جس پارٹی سے لوگوں کا مفاد وابستہ ہو،جس پارٹی کے الیکشن میں کامیابی کے امکانات زیادہ ہوں۔

۲۔ برادری اور برادری کے چوہدریوں کی بنیاد پر

لوکل سطح کی برادریاں،پھیلی ہوئی برادریاں، پیشہ ورانہ برادریاں،مظلوم برادریاں

۳۔ بااثر افراد کی بنیاد پر، اگر وہ ساتھ دے رہے ہوں

مقامی بااثر افراد،گلی محلے کے بااثر افراد، ذراوسیع سطح کے بااثر افراد جو تھانے کچہری اور دیگر دفاتر میں کام آتے ہیں یا کام آسکتے ہیں،مقتدر سرکاری ملازم جس امیدوار کی پشت پناہی کررہے ہوں،خوشی غمی میں تسلسل کے ساتھ شرکت کی ہو،علماء کرام ومشائخ عظام

۴۔ کام اور کارکردگی کی بنیاد پر

گلی محلے میں ڈویلپمنٹ کے کام کیے ہوں، علاقے کی بنیاد پر ڈویلپمنٹ کے کام کیے ہوں،لوگوں کو نوکریاں دلانے میں مدد کی ہو، ملازمین کے ملازمانہ مسائل (انفرادی) میں مدد کی ہو۔

۵۔ اثر پذیری کی بنیاد پر

پٹواری، تحصیل داراور ضلعی افسروں پر اثر ورسوخ ہو،تھانیدار، پولیس میں اثر ورسوخ ہو، علاقائی اور صوبائی دفاتر میں اثر ورسوخ ہو،امیدوار جو جرأت مند ہو اور غریبوں/مظلوموں کے حقوق کے لیے ڈٹ جاتا ہو اور امیدوار کی یہ عادت معروف ہو۔

6۔ منبر و محراب اور دینی مدارس

مساجد کے امام اور خطیب بھی ووٹ کے سلسلہ میں اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ دینی مدارس کے اساتذہ، طلبہ اور طلبہ کے والدین بھی ووٹ لینے دینے میں اثر رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ پیروں کی گدیاں اور اُن کے با اثر مریدوں کی الیکشن میں اہمیت بڑھ جاتی ہے۔

ووٹ کس بنیاد پر نہیں ملتے ہیں

محض نیکی اور دیانتداری کی بنا پر، ریلیاں اور جلسے خاص طور پر دینی سیاسی جماعتوں کی ریلیاں اور جلسے، عام ورکرز کی ڈور ٹو ڈور کمپین۔ البتہ امیدوار کی طرف سے ذاتی رابطہ کام کر سکتا ہے، اخباری بیانات، عوامی خدمت کے کاموں سے مثلاً الخدمت فاؤنڈیشن وغیرہ، درسِ قرآن اور دیگر نظریاتی حلقے، اخباری اشتہارات، ہینڈ بلز اور چاکنگ، فلیکس ہولڈنگز وغیرہ۔

کیا ہونا ضروری ہے؟

امیدوار کا وسیع تعارف جو پہلے سے موجود ہو۔ امیدوار کا اپنا ہارڈ نیوکلیس جو مخلص دوستوں پر مبنی ہو۔ الیکشن کے دوران کام کرنے والا مؤثر تنظیمی ڈھانچہ۔ ہر وارڈ میں کم از کم ایک مؤثر کارکن جو اپنے طور پر متحرک ہو۔ الیکشن کمپین کی ڈاؤن ٹو دی ارتھ تحریری شکل میں مؤثر منصوبہ بندی۔ انتخابی منصوبہ بندی کے نفاذ کی مانیٹرنگ کے لیے دو تین سینئر حضرات کی مانیٹرنگ ٹیم۔ پولنگ اسٹیشن پر مؤثر پولنگ ایجنٹس کی موجودگی۔

جماعتِ اسلامی اور دیگر دینی سیاسی جماعتوں کے امیدوار کا خصوصی ٹارگٹ

مسجد اور امام مسجد، بزرگ افراد جو باقاعدہ نماز پڑھتے ہوں، مستضعفین، غریب اور بے نوا لوگ، نوجوان خصوصاً بے روزگار جوان۔

ہم سمجھتے ہیں کہ کہ معاشرے کے تار و پود کو جانے بغیر کوئی ایسی دینی سیاسی جماعت جس کے پاس نہ جاگیردار ہوں نہ مشائخ عظام اور جس کے پاس نہ تو دینی مدارس کا نیٹ ورک ہو اور نہ ہی علماء کرام کا سلسلہ، کوئی انتخابی معرکہ سر نہیں کر سکتی۔ اُسے سائنسی بنیادوں پر تجزیاتی حکمت عملی اپنانا ہو گی جس سے وہ معاشرے کے مختلف اجزاء کا فہم حاصل کرے، ان کی

ضرورتوں، اُن کی دکھتی ہوئی رگوں کا شعور اور اُن کے انفرادی اور اجتماعی مسائل کم کرنے کے طریقے دریافت کرے اور اُن کی ذہنی سطح پر اُتر کر اُن سے محبت بھرا رابطہ کرے۔ یہ محنت طلب اور وقت طلب کام ہے اُس طریقے کے مقابلے میں جس میں فلیکس ہولڈنگ لگائے، ریلیاں نکالی اور کارنر میٹنگ کی جاتی ہیں، جو آسان ہے لیکن نتیجہ خیز نہیں ہے۔ بقول ایک دینی دانشور کے کہ معاشرے میں اس طرح پھیل جائیں جس طرح پانی ہموار میدان میں گھاس کے نیچے نیچے ہر طرف پھیل جاتا ہے لیکن نظر نہیں آتا اور اپنا کام کر جاتا ہے تو اس طرح کی حکمتِ عملی موثر نتائج دکھاتی ہے۔

معاشرے میں انتخابی نفوذ کے لیے معاشرتی آبادی کے خدوخال جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ اگر آپ میکرو لیول پر آبادی کو متاثر کرنا چاہتے ہیں تو آبادی کی نوعیت جاننا ضروری ہے۔ ہمارے مطالعہ کے مطابق پاکستان میں آبادی کے خدوخال کچھ اس طرح ہیں۔

الف۔ دیہاتی آبادی: 50 فیصد دیہاتی آبادی کی تقسیم

بے زمین کسان 15 فیصد	چھوٹے زمیندار 45 فیصد
بڑے زمیندار 15 فیصد	جاگیردار 2.0 فیصد
دستکار 5 فیصد	مزدور 5 فیصد
ملازمت پیشہ 10 فیصد	

ب۔ قصباتی آبادی 30 فیصد

چھوٹے زمیندار 20 فیصد	بڑے زمیندار 10 فیصد
جاگیردار 1.0 فیصد	ملازمت پیشہ لوگ 15 فیصد
ریڑھی والے خوانچہ فروش 5 فیصد	چھوٹے دکاندار 15 فیصد
بڑے کاروباری 5 فیصد	مزدور 10 فیصد
دستکار 10 فیصد	اہل علم ودانش 5.0 فیصد

ج۔ بڑے شہروں کی آبادی 20 فیصد

جن میں دیہاتوں اور قصبوں سے اُٹھ کر آنے والے لوگ، چھوٹے ملازمین، بڑے ملازمین، چھوٹے کاروباری، بڑے کاروباری، ریڑھی والے، خوانچہ فروش، دستکار، ریٹائرڈ بزرگ، مزدور وغیرہ شامل ہیں۔

رہائشی علاقوں سے قطع نظر آبادی کی تقسیم

زراعت سے متعلق آبادی۔ کاروبار سے متعلق آبادی۔ ملازمت سے متعلق آبادی۔ چھوٹے طبقات از قسم ریڑھی والے، خوانچہ فروش، رکشہ/ گاڑی ڈرائیور۔ ورکشاپوں کے ملازم، عمارتی مزدور۔ چھوٹے ملازم یعنی درجہ چہارم کے ملازم۔ متوسط درجہ کے ملازمین یعنی کلریکل سٹاف وغیرہ۔ مذہبی طبقات سے تعلق والی آبادی۔ کالجوں، یونیورسٹیوں کے طلبہ۔ بے روزگار نوجوان ۔گھریلو خواتین۔

ہمارے ملک میں قابل توجہ آبادی کے طبقات حسب ذیل ہیں جن کو اگر مائل کیا جائے تو انتخابی قوت بڑھ سکتی ہے۔

گھریلو خواتین۔ بیروزگار نوجوان۔ سال سے زائد عمر کے طلبہ۔ عمارتی اور ورکشاپس کے مزدور۔ چھوٹے ملازمین۔ اساتذہ۔ بزرگ نمازی۔ محلوں کی مساجد کے امام/ خطیب

اگر کوئی دینی سیاسی جماعت خاموشی کے ساتھ آبادی کے ان طبقات سے مئوثر رابطے کے نتیجے میں ان کی حمایت حاصل کر سکتی ہے تو معجزے کی توقع کرنا ممکن ہے۔ دینی سیاسی جماعتوں کے لیے ایک اور قابل غور تجویز یہ ہے کہ وہ اپنے پلیٹ فارم سے بھی زیادہ سے زیادہ جید علماء کرام کو ٹکٹ دیں اور دیگر سیاسی جماعتوں کو بھی دعوت دیں کہ اگر وہ کسی مستند عالم دین کو ٹکٹ دیتے ہیں تو دینی سیاسی جماعتیں اُن کے خلاف اپنا امیدوار کھڑا نہیں کریں گی نیز وہ اپنے طور پر بھی فیصلہ کریں کہ وہ جید علماء کرام کے مابین مقابلہ بازی کا ماحول نہیں بنائیں گے۔ اس طرح ممکن ہے کہ زیادہ سے زیادہ علماء کرام قانون ساز اداروں میں پہنچیں اور اس طرح سیکولرزم اور لبرلزم کا راستہ روکا جا سکے۔

الیکشن ۲۰۱۸ء کا منظر نامہ

الیکشن ۲۰۱۸ء کا منظر نامہ کچھ یوں نظر آتا ہے کہ بنیادی طور پر انتخابی معرکہ مسلم لیگ (ن) اور تحریک انصاف میں ہوگا۔ پیپلز پارٹی سندھ میں تو قابل ذکر نشستیں لے جائے گی لیکن باقی صوبوں میں اس کا حصہ زیادہ نظر نہیں آتا۔ ایم کیو ایم کے انتشار کا فائدہ پیپلز پارٹی اور ایم ایم اے میں تقسیم ہوگا بشرطیکہ جماعت اسلامی کا کارکن دل و جان سے ایم ایم اے کو قبول کرے، متحرک ہو اور جانفشانی سے کام کرے۔

الیکشن ۲۰۱۸ء میں ووٹ ضائع کرانے یا دینی سوچ رکھنے والوں کے ووٹ تقسیم کرانے میں تحریک لبیک پاکستان اور ملی مسلم لیگ مؤثر کردار ادا کرے گی۔ ان دونوں قوتوں کا نقصان بنیادی طور پر مسلم لیگ (ن) اور ایم ایم اے کو ہوگا۔ کراچی، فیصل آباد اور بعض دیگر شہری حلقے تحریک لبیک پاکستان کا ہدف ہوں گے۔ ملی مسلم لیگ بھی بعض شہری حلقوں میں اپنے وجود کا اظہار کرے گی۔ ایم ایم اے اگر کچھ حاصل کرنا چاہتی ہے تو سیٹ ایڈجسٹمنٹ کا فائدہ مسلم لیگ (ن) سے حاصل ہو سکتا ہے اور مستقبل کی حکومت سازی میں بھی ایم ایم اے اور مسلم لیگ (ن) قدرتی حلیف نظر آتے ہیں۔ جماعت اسلامی کی کرپشن کے حوالے سے نواز شریف کے خلاف لاحاصل ایجی ٹیشن پہلے ہی جماعت کی صفوں میں کافی نقاہت پیدا کر چکی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک دعوتی جماعت کو سیاسی مخالفت میں کسی سیاسی گروپ کے خلاف اتنا دُور تک نہیں جانا چاہیے کہ اس گروہ کے لوگوں کے ساتھ تعامل ہی ممکن نہ رہے۔ دوسری طرف اُسی طرح کے کرپٹ عناصر سے بالائی سطح پر میل جول رکھنا کسی اصولی نقطۂ نگاہ کی مزید بھد اُڑا دیتا ہے۔

ملک میں قابل ذکر دینی سیاسی قوتیں دو ہی ہیں۔ ایک جماعت اسلامی اور دوسری جمعیت علماء اسلام اور اب متحدہ مجلس عمل کے بحال ہونے کے بعد ایم ایم اے زیادہ بڑی سیاسی قوت بن گئی ہے۔ یہ قوت دینی حوالے سے سیکولرزم اور لبرلزم کے خلاف ایک مؤثر پریشر گروپ تو بن سکتی ہے لیکن اقتدار مطلق حاصل نہیں کر سکتی۔ اور موجودہ صورت حال میں ایم ایم اے کو اقتدارِ مطلق حاصل نہ ہو تو اسی میں خیر پنہاں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دینی سیاسی قوتوں نے نہ تو کوئی ہوم ورک کیا ہے اور نہ ان کے پاس ایسے رجال کار ہیں جو اسلامی نظام کے تقاضوں کے مطابق حکومت چلا سکیں۔ ایم ایم اے صوبہ خیبر پختون خواہ کی سابق حکومت اس کی دلخراش مثال ہے۔ اُس زمانے میں بعض عزت مآب وزراء کرام کے بسوں میں سفر کے فوٹو تو میڈیا

میں آتے رہے لیکن نظام کو اسلامیانے یا کم از کم کچھ درست کرنے کی ٹھنڈی ہوا کہیں سے نہ آئی۔ لے دے کر حسبہ بل کا غلغلہ بلند ہوتا رہا لیکن آخر تک تشنۂ تعبیر ہی رہا۔ جس طرح ہمارے دستور میں ہے کہ قرآن وسنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اسی طرح دینی سیاسی قوتیں اسمبلی میں پہنچ کر صرف اتنا ہی کرتی رہیں کہ حکومت وقت اسلام کے خلاف کوئی انتظامی یا قانونی قدم نہ اُٹھا سکے تو بڑی کامیابی شمار ہوگی اور اگر اس سے بڑھ کر کچھ مثبت اسلامی اقدامات کرا سکیں تو مزید خوشی کی بات ہوگی۔

متحدہ مجلس عمل میں شامل پارٹیاں اور ووٹرز کا متوقع طرزِ عمل

متحدہ مجلس عمل میں جمعیت علماء اسلام، جماعت اسلامی، جمعیت اہل حدیث، جمعیت علماء پاکستان (نورانی) اور شیعہ حضرات میں سے علامہ ساجد نقوی کا گروپ شامل ہیں۔ مسلکی گروہوں کے اندر تقسیم در تقسیم کی وجہ سے جمعیت اہل حدیث، جمعیت علماء پاکستان (نورانی) اور علامہ ساجد نقوی شیعہ گروپ کی ووٹنگ قوت قومی انتخابات میں کوئی قابل ذکر حیثیت نہیں رکھتی۔ جمعیت علماء اسلام اور جماعت اسلامی کے ووٹرز کی ملکی سطح پر عموماً اور صوبہ خیبر پختون خواہ میں خصوصاً معقول تعداد موجود ہے جو اگر یک جہتی کا مظاہرہ کریں تو قومی اسمبلی کی چالیس سے پچاس نشستیں نکال سکتی ہیں۔

لیکن حقیقت پسندانہ صورت حال یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا ووٹر نظم کی پابندی کرتے ہوئے جمعیت علماء اسلام کے امیدوار کو تو ووٹ دے دیتا ہے لیکن جمعیت علماء اسلام کا ووٹر اپنے گہرے تاریخی مذہبی تعصب کی وجہ سے جماعت اسلامی کے امیدوار کو ووٹ نہیں دیتا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ جمعیت علماء اسلام متحدہ مجلس عمل کی وجہ سے اپنے حقیقی حجم سے زیادہ امیدواروں کو کامیاب کرالے گی جب کہ جماعت اسلامی اپنی حقیقی قوت سے بھی کم ووٹ حاصل کرے گی اور اس طرح نقصان میں رہے گی۔ ہاں اگر ایم ایم اے مسلم لیگ (ن) کے ساتھ سیٹ ایڈجسٹمنٹ کرے تو لاہور کی ایک دو روایتی نشستوں کے علاوہ پنجاب اور کراچی میں دو تین مزید نشستیں حاصل ہو سکتی ہیں جو زیادہ تر جماعت اسلامی کے حصہ میں آئیں گی۔ اگر ہمارا تجزیہ درست ثابت ہوتا ہے تو آئندہ الیکشن میں اسلامی ذہن کی موثر لابی قومی اسمبلی میں پہنچ جائے گی جو خیر کی علامت ہوگی۔

اسلام اور مغرب　　سید خالد جامعی[۱]

فراہمیٔ عدل وامن میں
جدیدیت اور جدید ریاست کی ناکامی (آخری قسط)

ہیگل کہتا ہے کہ روایتی تہذیبوں میں فطری آزادی اصلاً آزادی نہیں تھی وہ تو صرف آوارگی کا نام تھا۔آزادی خام شکل کا نام نہیں آزادی تو شعور آزادی کی حقیقت (Consiousness of Freedom) میں آگہی ہے۔ یورپی اقوام کے سوا سب قومیں اس شعور سے محروم ہیں۔ہیگل آزادی کے عقیدے کا علمبردار ہے۔آزادی معروضی عقیدے کے طور پر دنیا قبول کرے گی تو تاریخ کا خاتمہ ہوجائے گا کیوں کہ آزادی کے ذریعے ہی ترقی ممکن ہوگی اس لیے ہیگل کے جدلیاتی فلسفہ تاریخ کے تحت ہر اگلا زمانہ پچھلے زمانے سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے کیوں کہ وہ پچھلے دور سے زیادہ عاقل، بہتر، ترقی یافتہ ہوتا ہے۔یعنی ترقی ہی معیار خیروشر ہے، ترقی ہی معروضی ،آفاقی اور بدیہی حقیقت ہے جو آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔

ہیگل کے افکار کا اصل متن پڑھیے:

The State is the Divine Idea as it exisits on Earth. We have in it, therefore, the object of history in a more definite shape than before, that in which freedom obtains objectivity, and lives in the enjoyment of this objectivity.[G.W.F Hegel, The Philsophy of History New York : Cosimo Inc: 2007, P.39]

The goal of attainment we determined at the outset is Spirit in its completensess, in its essential nature i.e. Freedom. This is the fundamental object, and therefore also the leading principle of the development - that whereby it receives meaning and importance .[Hegel, ibid P.55]

کالونیل ازم، استعماریت اور ترقی کی مابعدالطبیعیات کے اہم مصادر

بعض سادہ لوح لوگ کہیں گے کہ استعماری ریاستیں تو ہابس، لاک، کانٹ، ہیگل سے

[۱] دانشور، مصنف، جامعہ کراچی

پہلے بھی تھیں یہ محض خطابت اور دعویٰ ہے۔قدیم اور جدید ریاستوں میں کیا فرق ہے؟ اسے جاننے کے لیے پڑھیے:

Ellen Meiksins Wood : *Empire of Capital*

حقیقت یہی ہے کہ ترقی اور استعماریت تو ہابس، جان لاک، کانٹ، ہیگل کے فلسفوں اور Cult of Reason, Rational Capacity اور Theory of history کے مفروضوں کے بغیر پیدا ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ بلاشبہ مغرب کی ترقی یافتہ قوموں کی استعماریت، تشدد، اور دہشت گردی کی بنیادیں انہی فلسفیوں نے مہیا کیں۔ان مباحث کے لیے درج ذیل کتابیں دیکھیے:

(1) Hobbs : *Social Contract*
(2) J.Lock *Two Treatise of Government*
(3) G.W.F. Hegal: *The Philosophy of History*
(4) S.Elden : *Reading Kant's Geography*
(5) *Anthropology from the Pragmatic Point of View.* کانٹ کا ایک اہم مضمون

ہابس، لاک، روسو کی سوشل کنٹریکٹ تھیوری کے تقابلی مطالعے کے لیے ایک کتاب پڑھیے:

(6) Chirstopher W. Monis : *The Social Contract Theorists : Essays on Hobbes, Lock & Rosseau.*

جدیدیت، جدید امریکا، جدید فرانس، جدید مغرب دہشت گردی اور جدید عالمگیر جنگوں کی بربریت کے ملبے سے ہی طلوع ہوئے ہیں۔جدیدیت کا خمیر ضمیر ہی دہشت، وحشت اور بربریت سے نکلا ہے۔اس دہشت گردی کی تاریخ سے ہم ناواقف ہیں۔

فطرت دشمنی کے بغیر جدید سائنسی ترقی ممکن نہیں

ہزرل جدید سائنس کو یورپی سائنس کہتا ہے۔کانٹ کے مطابق دنیا کی تمام قوموں کے پاس عقل تو ہے مگر Rational Capacity نہیں ہے، یہ صرف یورپ کا اختصاص ہے۔وہ کہتا ہے انسان کی عقل کو فطرت سے الگ کرو کیوں کہ فطرت سے الگ کیے بغیر Rational Capacity پیدا نہیں ہوسکتی دوسرے معنوں میں وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ اس خاص صلاحیت

کے بغیر سرمایہ جمع کرنے، ترقی، تبدیلی (Improvement/Change) کی صلاحیت حاصل نہیں ہوسکتی، اس کے بغیر ترقی بھی ممکن نہیں، اس کے بغیر انسان کائنات پر اپنا ارادہ بھی مسلط نہیں کرسکتا۔

عالم اسلام نے دنیا پر ایک سائنس، ایک معیشت مسلط نہیں کی

اسلامی خلافت میں ہر خطے کی اپنی سائنس تعلیم اور اپنی معیشت تھی۔ کانٹ کی اصطلاح Rational Capacity یونان اور ازمنہ وسطیٰ کی عقلیت نہیں یہ محض دلیل، عقلیت اور صرف Reason نہیں بلکہ جدید سائنسی عقلی ڈھانچوں (Scientific Rational Sturctues) میں ظہور کرتی ہے اس لیے ہزرل جیسا فلسفی فخر کے ساتھ جدید سائنس کو آفاقی، عالمی سائنس نہیں کہتا بلکہ یورپی سائنس (European Sciences) کہتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مغرب اور اس کے فلسفی ایک جانب سائنس کو اپنا قومی علم بتاتے ہیں اور سائنس کی پھیلائی ہوئی تباہی ماحولیاتی آلودگی کی ذمہ داری پوری دنیا پر ڈال دیتے ہیں۔

علم قومی مقامی لیکن اس کی پھیلائی ہوئی تباہی کو درست کرنے کی ذمہ داری پورے عالم کی۔ اسی رویے کا نام استعماریت اور حقوق انسانی ہے۔

عالم اسلام نے پوری دنیا پر کوئی یکساں [Uniform] سائنس مسلط نہیں کی کیوں کہ خلافت کالونیل ازم اور استعماریت نہیں تھی۔ خلافت کا مقصد اللہ کے بندوں کو اللہ کی جنت کا حق دار بنانا تھا اس کے لیے استعماری سائنس، استعماری معیشت، استعماری نظام تعلیم کی ضرورت نہیں تھی۔ خلافت نے جن علاقوں کو فتح کیا وہاں معاشی لوٹ مار نہیں کی، نہ وہاں کے وسائل چھین کر لے گئے۔

خلافت نے دنیا پر یکساں نظام تعلیم، یکساں نظام سیاست و معیشت مسلط نہیں کیا ہر خطے، علاقے کی اپنی سائنس، اپنی تعلیم، اپنی سیاست اور معیشت تھی جس کا تعلق اس خطے کی ضروریات، وسائل، مسائل، حالات، اسباب سے براہ راست تھا۔ روایتی تہذیبوں میں سائنس، معیشت، تعلیم، ہر علاقے کی ثقافت کے ساتھ جڑی ہوتی تھی وہ مقامی ہوتی تھی عالمی نہیں۔ مغرب نے اپنا نظام تعلیم، معیشت، سائنس جو یورپی، مقامی، قومی، علاقائی تھی اسے آفاقی کہہ کر پوری دنیا پر مسلط کردیا۔ جرمنی کا سب سے بڑا فلسفی ہزرل جدید سائنس کو یورپی

سائنس کہتا ہے اس کی کتاب کا نام بھی یورپین سائنسز ہے۔ مغرب نے معیشت کو ثقافت، ماحول، موسم، مقامی اسباب، وسائل سے الگ کر دیا اسے صرف کھیل تماشہ تخلیقی لہوولعب بنا دیا۔

تمام انسانوں کی ضروریات اور اسباب کو ایک جیسا تصور کرنا استعماری تصور علمیت ہے ایسا استعمار تاریخ میں کبھی پیدا نہ ہوا۔ اللہ نے ہر خطے، علاقے اور انسان کو تنوع (Diversity) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ ہر شخص کا مزاج، عقل، شعور مختلف ہے ہر علاقے کا موسم، اسباب، وسائل، ضروریات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں لہٰذا پوری دنیا پر ایک جیسے علوم کا تسلط، ترقی، استعماریت اور دہشت گردی کے سوا کچھ نہیں۔

کانٹ سرخ ہندیوں کو انسان ہی تسلیم نہیں کرتا

کانٹ اور لبرل ازم انسانیت کی جو تعریف متعین کرتے ہیں اس انسانیت کے دائرے سے بنی نوع انسان کی اکثریت خود خارج ہو جاتی ہے۔ ہیگل افریقیوں کو Animal man کہتا ہے۔

کانٹ کی Rational Capacity کی تعریف کے تحت صرف گوری چمڑی والوں کے سوا کوئی Human نہیں ہو سکتا۔ وہ لکھتا ہے کچھ ایسی نسلیں (Races) ہیں کہ ان کو اگر تعلیم دی جائے تو وہ شاید کچھ بہتر ہو جائیں لیکن عقل کے درست استعمال کی فطری صلاحیت (Natural Capacity) صرف ہمارے ہی پاس ہے۔ اگر سرخ ہندی اور کسی گورے کے مابین معاہدہ طے ہو گیا اور گورا اس معاہدے کی خلاف ورزی کر کے سرخ ہندی کی زمین چھین لے تو کانٹ کی عالمی اخلاقیات (Universal Morality) اور Categorical Imperative کے تحت یہ غیر اخلاقی کام تصور کیا جانا چاہیے مگر کانٹ ایسے معاہدے کے بارے میں لکھتا ہے کہ:

معاہدہ تو دو مساوی فریقوں کے مابین ہوتا ہے یعنی سرخ ہندی تو انسان ہی نہیں ہیں۔ ان کے پاس Rational Capacity ہی نہیں۔ گورا ایک عاقل فائق بشر ہے۔ دوسرے معنوں میں کانٹ یہ کہہ رہا ہے کہ گورا جو چاہے کر گزرے کیوں کہ وہ سرخ ہندی پر فوقیت رکھتا ہے۔ وہ برتر و بہتر ہے۔ گورا Human ہے سرخ ہندی تو ہیومین ہی نہیں ہے۔ اسی فلسفے نے عالمی استعماریت، کالونیل ازم پیدا کیا۔

تمام جدید فلسفی انسانوں کے،انسانیت کی فطرت کے دشمن ہیں۔فطرت سے دشمنی کرکے،فطرت کی مخالفت کرکے،فطرت پر قابو پا کر تمام انسانوں کو فطرت،فطری زندگی سے کاٹ کر ہی جدید سائنسی ترقی ممکن ہوئی ہے لہٰذا جدید فلسفے سے نکلنے والی جدید سائنس اور جدید ریاست پُرتشدد ہی ہیں۔یہ کائنات کے بھی دشمن ہیں اور انسانوں کے بھی دشمن ہیں۔دنیا کی تباہی، بحر و بر اور ہوا میں آلودگی اسی ترقی کا نتیجہ ہے۔ترقی کے نتیجے میں دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ کہہ رہا ہے کہ زمین کے خاتمے سے پہلے انسان دوسرے کروں [Planets] میں آشیانہ تعمیر کرلے۔اتنا بڑا سائنس دان اور فلسفی زمین کے کرہ کو بچانے کے بجائے مشورہ دے رہا ہے کہ دوسرے کروں میں نئی زمین تلاش کرو۔ترقی سے آنے والی تباہی کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ کیجیے:

(1) Noami Klein : *This changes everything: Capitalism Vs the Climate*

(2) Algore : *An Inconvenient Truth*

(3) Noami Oreskes : *The Collaps of Westren Civilization*

سائنس گرامر آف پاور ہی ہے اور جدید ریاست سائنس اور سرمایے کی تنظیم اور مارکیٹ اور سائنس کی تجسیم کا نام ہے۔جب ہم یہ کہتے ہیں کہ جدید ریاست مارکیٹ اور سرمایہ کی تنظیم ہے تو اس کو سمجھنے کے لیے ایک مثال دیکھیے۔

کارپوریشن کو اپنا کوڑا خود اُٹھانا پڑے تو کوڑے کا مسئلہ حل ہوجائے گا

۲۰۲۵ء تک سمندروں میں مچھلیوں سے زیادہ پلاسٹک کی تھیلیاں ہوں گی۔اگر جدید ریاست تمام کارپوریشن پر پابندی لگادے کہ وہ اپنی تمام مصنوعات بیچنے کے بعد ان مصنوعات سے پیدا ہونے والا کوڑا بھی خود ہی اُٹھائیں گی تو جدید ریاست میں کوڑے کو ٹھکانے لگانے کا مسئلہ خود ہی ختم ہوجائے گا بلکہ کارپوریشن ہی ختم ہوجائے گی کیوں کہ کارپوریشن Disposable Culture کے ذریعے فروخت میں اضافہ کرتی ہے لہٰذا کوڑا بڑھتا جاتا ہے۔ریاست کارپوریشن کو پابند کردے کہ وہ بلب اور بلب کے ڈبے،ٹیٹرا پیک، پینے کی بوتلیں،ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب، برش،ڈبے خود ہی اُٹھا کرلے جائیں گے تو مارکیٹ بند ہوجائے گی۔ مارکیٹ،سرمایہ اور سائنس جدید ریاست کی سرپرستی کے بغیر چل نہیں سکتی۔

پلاسٹک بنانے والی تمام کمپنیوں کو پابند کردیا جائے کہ وہ پلاسٹک کا کوڑا خود اُٹھائیں گی تو تمام سمندر، دریا، ندی، نالے ایک دن میں صاف ہوجائیں گے۔

ورلڈ اکنامک فورم کے مطابق 2025ء تک سمندروں میں مچھلیوں سے زیادہ پلاسٹک کی تھیلیاں ہوں گی۔ ہر سال سمندر میں 9 بلین ٹن پلاسٹک پھینکا جاتا ہے۔ سالانہ 500 بلین پلاسٹک بیگ استعمال ہوتے ہیں۔ 50 فی صد پلاسٹک کی اشیاء ایک بار استعمال کے بعد پھینک دی جاتی ہیں۔ ہر ایک منٹ میں پلاسٹک کی دس لاکھ بوتلیں خریدی جاتی ہیں۔ تمام کوڑے کا دس فی صد پلاسٹک کے کوڑے پر مشتمل ہے۔ ہر ایک منٹ میں کوڑے کا ایک ٹرک سمندر میں پھینکا جارہا ہے۔ سمندر، ہوا، موسم، پانی، ماحولیاتی نظام کو پلاسٹک تباہ کررہا ہے فورم کی رپورٹ پڑھیے:

A study by the World Economic Forum claims that by 2025, there will be more plastic than fish in the oceans. Incidentally, India is among the top four biggest plastic polluters in the world. And, according to some reports, responsible for around 60 per cent of the 8.8 million tons of plastic dumped into the world's oceans every year.

Every year the world uses 500 billion plastic bags; each year, at least 8 million tons of plastic end up in the oceans, the equivalent of a full garbage truck every minute.In the last decade, we produced more plastic than in the whole last century; 50pc of the plastic we use is single-use or disposable; we buy one million plastic bottles every minute; plastic makes up 10pc of all of the waste we generate.Plastic bags and climate change are linked - from air quality to ocean toxicity, plastic bags contribute to eco-system disruption. [DAWN 21-2-2018]

پینگوئین کی کتاب *The Waste* پڑھ لیجیے۔ اس کی مصنفہ نے لکھا ہے کہ تاریخ انسانی کی تمام تہذیبوں نے اجتماعی طور پر اپنے ادوار میں اتنا کوڑا پیدا نہیں کیا جتنا کوڑا جدید مغربی تہذیب پیدا کررہی ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ اس ایک کرۂ ارضی میں پیدا ہونے والے کوڑے کو ٹھکانے لگانے کے لیے ہمیں زمین جیسے دو کرے درکار ہیں۔

یہ تمام تفصیلات اسی لیے دی گئی ہیں کہ جدید ریاست عدالت اور جدید دنیا میں ترقی اور تعلیم ،تبدیلی ،تغیر اور ارتقاء کے نام پر ہونے والی دہشت گردی کی تاریخی بنیادوں کا علم ہوجائے ہم سمجھتے ہیں کہ تہذیب،، تمدن، اخلاقیات مغرب نے سکھائے ہیں اس مغرب کی حقیقی تاریخ اور حقیقی چہرہ ہی خونی ،قاتل، وحشی اور درندے کا ہے۔جدیدیت اصلاً صرف مذہب دشمن نہیں وہ فطرت ،قدرت ، مذہب ، روایت انسان ، ماحولیات اور کائنات دشمن بھی ہے وہ کائنات کو جنت بنانے کے نام پر جہنم میں تبدیل کررہی ہے۔

جدیدیت ، کالونائزیشن ،ترقی کے تمام عقیدے تشدد سے پیدا ہوئے ہیں ۔لبرل ازم کے علمبردار امریکا کی تاریخ امریکا پر قبضے ، برطانیہ سے جنگ آزادی اور اس کے بعد سول وار سب تشدد کی تاریخ ہے ۔جدید ریاست ، سیاست، عدالت تشدد کی پیداوار ہے۔اس سے تشدد ہی نکل سکتا ہے ۔انقلابِ امریکا ، انقلابِ فرانس ، انقلابِ روس ، انقلابِ جرمنی ، سب بدترین تشدد کی تاریخ ہیں۔

انقلاب فرانس کے دہشت گرد رابس پائرے کی دہشت گردی

ہفتہ دس دن کا ہوگا۔ اتوار غائب کردیا گیا کہ کلیسا یاد نہ آئے۔ M.F.M.I Robespierre انقلاب فرانس کا ایک اہم انقلابی رہنما تھا وہ دہشت گردی میں بھی مصروف رہا۔انقلاب میں لاکھوں لوگوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔

[Reign of Terror] کی اصطلاح پائرے جیسے متشدد انقلابیوں کے پیدا کردہ دہشت گردانہ ماحول کے لیے ایجاد ہوئی تھی وہ نیشنل کنونشن کا صدر بھی رہا اور کمیٹی آف پبلک سیفٹی کا رکن بھی۔ اس نے بے شمار لوگوں کا قتل عام کیا۔ اس کی دہشت گردی کا مقصد مذہبی قوتوں کا خاتمہ، تطہیر اور معاشرے میں موجود انقلاب کے دشمنوں کا قتل عام تھا۔

Radical Purification of Politics through the Killing of Enemies

آخر کار Thermidorian Reaction کے نتیجے میں اسے Tyrant قرار دیا گیا اور یہ دہشت گرد بغیر عدالتی کاروائی کے صفائی کے موقع کے حصول کے بغیر ہی ایک دن میں قتل کردیا گیا۔

رابرس پائرے مذہب سے دشمنی میں اس قدر آگے چلا گیا کہ اس نے دس دن کا نیا ہفتہ [NewWeek] متعارف کرایا۔اس ہفتے[Week] سے اتوار کا دن غائب کر دیا گیا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو اتوار کے دن عبادت اور کلیسا یاد نہ آئے۔لوگوں کے ماضی کو کھرچنے، تاریخ اور مذہب سے کاٹنے کے لیے یہ نیا اسلوب اختیار کیا گیا۔

انقلاب فرانس اور انقلابی دہشت گردی و بربریت کے لیے مندرجہ ذیل کتابیں دیکھیے :

(1) Thomas Carlyle : *The French Revolution*

(2) Eugen Weber : *Peasants into Frenchmen : The Modernization of Rural France 1870-1914*

عوام کو مذہب سے جبراً الگ کرنے کی دلیل پائرے نے یہ دی کہ ہمارے مذہب کا نام ہے Cult of Reason۔جدیدیت کی عقلی اور عملی دہشت گردی کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر مذہب دشمن ہے۔

جدید فلسفیوں کے فلسفے نے امریکا میں Lynch Law بنوائے

ہابس، لاک،، ہیگل کانٹ کے فلسفۂ نسل پرستی کے نتیجے میں امریکا میں کئی سالوں تک Lynch Laws موجود تھے جن کے تحت اگر کسی کالے کو غلط کام میں ملوث دیکھ کر گوروں کا گروہ مشتعل ہو کر انھیں عدالت کے بغیر قتل کر دیتا تو یہ قتل قانون کی نظر میں جائز تھا۔

امریکی lynch law چارلس لنچ اور کیپٹن ولیم لنچ نے تخلیق کیا۔عوامی انصاف Street Justice,Mob Justice,Popular Justice کا آغاز ریاست ورجینیا امریکا سے 1782ء میں ہوا۔

American Revolutionary War کے دوران اس قانون پر عمل کیا گیا۔ ہزاروں کالوں کو گوروں کے ہجوم نے قتل کیا۔ یہ انسانیت تھی تفصیلات کے لیے درج ذیل مصادر دیکھیے:

(1) American National Biography Online

(2) C. Waldrep :*The Many Faces of judge Lynch: Extralegal Violence and Punishment in America.*

(3) J.A. Culture, *LYNCH - LAW : An Investigation into* the history of lynching in the United States.

"LYNCH-LAW" کے مصنف جیمس البرٹ کلچر نے کتاب کے تعارف میں ہجومی قتل عام کے بارے میں لکھا کہ:

It has been said that our country's national crime is lynching which is peculiar to the United States, it is to be found in no other country of a high degree of civilization

اسی کتاب کے دیباچے میں وہ لکھتا ہے:

Few people are able to read about lynch-executions, with atrpoxcious forms of torture and cruel death, such as have occurred from time to time within ten years in this country, without a feeling of national shame.

امریکی قانون کے تحت گوروں کا ہجوم کسی بھی کالے کو قتل کرسکتا تھا

آج ایک امریکی قدیم نفسیات کے تحت گوروں کے ہجوم کا قتل کرتا ہے۔ امریکا میں روزانہ چار لوگ گولیوں سے مرتے ہیں۔ امریکا نے Lynch Execution ختم کردیا مگر امریکی نفسیات اس جرم سے اتنی مانوس ہے کہ وہاں اسکول کے بچے بھی قتل عام کررہے ہیں جب امریکا ترقی یافتہ نہیں تھا صرف نسل پرست تھا تو گوروں کا ہجوم ایک کالے فرد کو قتل کرتا تھا اب امریکا ترقی یافتہ ہے لہٰذا ایک گورا فرد ہجوم کو قتل کردیتا ہے۔

یہ ہجوم صرف کالوں کا نہیں کالوں سے زیادہ گوروں کا ہے Rational Capacity والا گورا کسی بھی اسکول، کیمپ، کنسرٹ، گے کلب، مال پر حملہ کرتا ہے کئی گوروں کو قتل کردیتا ہے اوکلاہاما کے حادثے سے لے کر ۲۰۱۷ء میں لاس ویگاس اور ۲۰۱۸ء میں فلوریڈا کے اسکول تک دہشت گردی کی تاریخ بار بار دہرائی جارہی ہے۔

امریکا میں ہر سال ایسے دس پندرہ واقعات ہوتے ہیں۔ امریکی نفسیات دہشت گردی کی نفسیات ہے۔ سرخ ہندیوں کے قتل عام، برطانیہ سے جنگ آزادی، امریکی سول وار سے جو مزاج بنا ہے وہی آج تک موجود ہے روزانہ فائرنگ سے امریکا میں چار لوگ ہلاک ہوتے ہیں ہر شخص کے پاس ہتھیار رہے۔ گھروں، بازاروں، عوامی مقامات پر بندوق چلا کر قتل کرنا عام

بات ہے۔ دنیا کی سب سے بڑی سول سوسائٹی کی یہ اخلاقیات ہے ۔ نیویارک ٹائمز کے اداریے کے مطابق ہر ہفتے ایک امریکی عورت شوہر، عاشق، دوست کی بندوق سے قتل ہوتی ہے۔ اوباما رپورٹ کے مطابق امریکا میں کروڑوں عورتوں سے جبری بدکاری ہوتی ہے۔ امریکی فوج میں کوئی فوجی عورت جنسی دہشت گردی سے محفوظ نہیں۔

فلوریڈا کے نکولس کروز نے اسکول میں ۱۷ لوگوں کو قتل کردیا۔ 2018ء کے سال کے پہلے 7 ہفتوں کے دوران امریکا کے اسکولوں میں بلا اشتعال فائرنگ کا یہ 18واں واقعہ ہے۔ ان تمام کاروائیوں کا ارتکاب سفید فام بچوں نے کیا اور بلا استثنا ہر جگہ لائسنس یافتہ اسلحہ استعمال ہوا۔ تمام ملزمان کی عمر 14 سے 18 سال ہے۔ یکم فروری کو کیلی فورنیا کے سب سے بڑے شہر لاس اینجلس میں تو مڈل اسکول کی ایک 15 سالہ بچی پستول کلاس میں لے آئی اور تین بچوں کو زخمی کردیا۔ بلا اشتعال فائرنگ سے مرنے والوں کی تعداد 25 گنا ہے۔ دنیا کے صرف 5 فی صد لوگ امریکا میں آباد ہیں لیکن دنیا کا 44 فی صد لائسنس یافتہ اسلحہ امریکی شہریوں کے پاس ہے۔

2008ء میں امریکی کانگریس کی جانب سے لیے گئے جائزے کے مطابق اس وقت امریکا کی آبادی 30 کروڑ پچاس لاکھ تھی جب کہ شہریوں کے پاس آتشیں اسلحہ کی تعداد 31 کروڑ تھی۔ ہر سو امریکیوں پر 101 بندوقیں، پستول اور خودکار آتشیں اسلحہ ہے۔

امریکا کی ریاست شہر فلوریڈا کے اسکول میں AR-15 رائفل سے فائرنگ کر کے ۱۷ بچوں کو ہلاک کرنے والے انیس سالہ قاتل NIKOLASORUZ کے بارے میں رپورٹ شائع ہوئی ہے

No Idea we had a monster under our roof [AFP 20-2-2018]

حقیقت یہ ہے کہ جدیدیت کی چھت کے نیچے ہر قسم کے شیاطین جمع ہیں۔ آزادی، مساوات، ترقی کا عقیدہ بڑے بڑے بھوتوں کو جنم دے رہا ہے۔ جب تک عقیدہ ٹھیک نہیں ہوگا دہشت اور وحشت کا سفر جاری رہے گا۔ صرف امریکا ہی نہیں دنیا میں ہر جگہ، پاکستان میں بھی قاتل، درندے، وحشی، جنسی پاگل اسی عقیدے کا ثمر ہیں۔

وکیل جدید سیکولر لبرل قومی ریاست کے فقہا ہیں

کوئی بچہ اردو استاد کے بغیر کیوں نہیں پڑھ سکتا؟ ریاست نہ عاصمہ جہانگیر کی سمجھ میں آئی

نہ وکیلوں کے۔ عاصمہ جہانگیر اگر فلسفہ پڑھ لیتیں تو ان کو آزادی اور ہیومین رائٹس کے عقیدے کی دہشت و وحشت کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ جدید ریاست میں انصاف کاروبار ہے لہٰذا وکیل جو اس ریاست کے فقیہہ ہیں، نہ ریاست کو سمجھنا چاہتے ہیں نہ انسانی حقوق، ترقی اور سائنس کی تاریخ کو کیوں کہ ان کا روزگار صرف اور صرف ہیومین رائٹس سے ہی چلتا ہے جتنے زیادہ قوانین ہوں گے وکالت اتنی ہی زوردار چلے گی۔ ہیومین رائٹس کے نتیجے میں ہزاروں قوانین بنتے رہتے ہیں کیوں کہ آزادی کا عقیدہ درندے پیدا کرتا رہتا ہے۔ دنیا کی کسی تہذیب میں لاکھوں قوانین نہیں تھے جس طرح مغرب میں ہیں لہٰذا جدید ریاست میں وکیلوں کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔

لاکھوں قوانین کی موجودگی میں جدید ریاست وکیلوں کے بغیر ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ جس طرح اسلامی تہذیب اور اسلامی زندگی مولوی کے بغیر ایک دن بھی نہیں چل سکتی۔ مولوی اور اسلام لازم وملزوم ہیں۔ سرسید سے لے کر جاوید غامدی صاحب تک ہر متجدد نے عوام کو اجتہاد کی کامل آزادی دی مگر عوام دینی مسئلہ معلوم کرنے مولوی کے پاس جاتے ہیں کوئی خود مجتہد بننے پر تیار نہیں۔

حیرت ہے کہ اہل قرآن اور غامدی صاحب کہتے ہیں کہ ہر شخص قرآن مجید کو خود سمجھ سکتا ہے حدیث کا فہم خود حاصل کرسکتا ہے اس کے لیے مولوی مدرسے کی ضرورت نہیں لیکن کوئی اس سوال کا جواب نہیں دیتا کہ قرآن وحدیث کا علم مولوی مسجد مدرسے کے بغیر حاصل ہوسکتا ہے تو کیا دنیا کے تمام اسکولوں، کالج، یونیورسٹیوں سے تمام اساتذہ کو باہر نکال دیا جائے؟

سب سے افضل علم استاد کے بغیر حاصل کرنا ممکن ہے تو ان گھٹیا علوم کے حصول کے لیے کسی استاد کی کیا ضرورت ہے؟ حیرت کی بات یہ ہے کہ پاکستان میں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے لیکن اسکول، کالج، یونیورسٹی میں ہر جگہ اردو کے استاد پڑھاتے ہیں۔ اردو بولنے والے اپنی مادری زبان کی تعلیم اردو کے استاد کے بغیر حاصل کرنے کے قابل نہیں تو قرآن و حدیث کی تعلیم وہ خود کیسے حاصل کرسکتے ہیں؟

نائیل فرگوسن نے اپنی کتاب *The Great Degeneration* میں تمام جدید ریاستوں کی ناکامی کا ذمہ دار انہی وکیلوں کو ٹھہرایا ہے۔ دوسرے معنوں میں وہ کہہ رہا ہے کہ

قرضوں سے ترقی حاصل کرنے والی جدید ریاست جو سرمایہ دارانہ نظام نے قائم کی ہے اس کی تباہی کا سبب ترقی، قرضوں، سود، سٹے اور معیار زندگی بڑھانے کا جدید سرمایہ دارانہ نظام ہی ہے۔ وہ لکھتا ہے جدید ریاست میں Rule of Law نہیں Rule of Lawyers ہے۔ دونوں کا ایک ہی مطلب ہے سرمایہ کی حاکمیت، سرمایہ ہی سب کو چلا رہا ہے کیوں کہ قانون Law کا مطلب ہے سرمایہ کے نفاذ ونفوذ کا قانون Rule of Law of Capital وکیل سرمایہ دارانہ نظام کا فقیہہ ہے۔

تمام فساد کی اصل جڑ آزادی، مساوات، ترقی کا عقیدہ ہے

بندگی کا عقیدہ، وکالت کا خاتمہ، قاضی عدالت مسئلے کا حل ہیں۔ سرمایہ داری اور آزادی باطل عقیدے ہیں ان سے باطل ہی برآمد ہوسکتا ہے۔ لبرل ازم، سوشل ازم، کمیونزم نیشنل ازم سرمایہ داری کے عقیدے کے ہی نظریات ہیں۔ ان میں صرف جزوی اختلافات ہیں لہٰذا مسئلہ صرف وکیل کا نہیں، جدید قانون کا نہیں، جدید عقیدے، آزادی اور اس کی تجسیم سرمایہ دارانہ نظام کا ہے جب تک اسے ختم نہیں کیا جائے گا مسائل جوں کے توں رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ پھر حل کیا ہے؟ ہیومین رائٹس بھی غلط، ماورائے عدالت قتل بھی غلط، مجرموں کی رہائی بھی غلط، ان کی گرفتاری بھی غلط جیل میں نہ رکھنا بھی غلط، اس کا حل یہ ہے کہ پہلے سوال پر غور کیا جائے کہ اتنے مجرم کیوں پیدا ہو رہے ہیں؟

کراچی میں گزشتہ دس سال میں ایک لاکھ سے زیادہ مجرم قاتل ضمانت پر رہا ہوئے ہیں معاشرہ اتنے مجرم کیوں پیدا کر رہا ہے؟ ژی ژیک نے جو کہا ہے اس پر غور کریں۔ دوسرے سوال کا جواب نہ دیں پہلے سوال کا جواب دیں۔ تعلیم وترقی ہی درندے پیدا کر رہی ہے۔

تمام مسائل کی وجہ آزادی، مساوات، ترقی کا عقیدہ ہے۔ جب تک عقیدہ غلط ہے مجرم پیدا ہوں گے۔ ریاست بندگی کا عقیدہ اختیار کرے۔ معاشرے میں اخلاقی، روحانی، ایمانی انقلاب برپا کرے، وکالت کے پیشے کا خاتمہ کرے اور قاضی عدالت قائم کرے، یہ ہے آسان حل۔ لیکن لوگوں کو یہ پسند نہیں کیوں کہ اس میں اپنے ایمان اور کردار کو بہتر کرنا پڑتا ہے جس کے لیے امریکی، چینی امداد کی ضرورت نہیں تزکیۂ نفس کی ضرورت ہے۔

لبرل ازم حامد کمال الدین[1]

لبرل ازم کے مسلم علم برداروں کے طرزِ فکر اور طریقِ واردات کی تفہیم ضروری ہے

لبرل ازم، الحاد اور اسلام (آخری قسط)

مسلمان: تو پھر خدا کے ایک نافرمان کا خدا کے حکم سے سرتابی کا فیصلہ بھی اتنا ہی قابل قدر ہوا۔

لبرل: میں نے کہا نا آزادی سب سے بڑی قدر ہے۔

(بلکہ انسان پرست (Humanist) سپرٹ کے تحت، خدا کے حکم سے سرتابی کے وقت وہ زیادہ قابل قدر ہے! کیونکہ اس میں ''انسانی مرضی'' کا ظہور زیادہ ہوا۔ مگر یہ بات 'ابھی' منہ پر لانے کی نہیں یا پھر اپنے ملحد 'بھائیوں' کے لیے چھوڑ دینے کی ہے)۔ پاکستانی سوسائٹی میں لبرلزم فی الحال اپنے اول الذکر حوالے کو ہی عوامی سطح پر لے کر چل رہا ہے یعنی مذہبی ہونے کی صورت میں آپ کی 'مرضی' کا احترام۔ البتہ طبعی طور پر یہ احترام وہاں بڑھ جائے گا جہاں اس کا معبود 'انسانی مرضی' اپنی مطلق العنانیت کا ظہور کرے، یعنی اپنے ماسوا کسی ہستی کی ''مرضی'' کے آگے جھکنے سے اِبا کرنے لگے۔ ذاتِ انسانی (Human Ego) کا اثبات ظاہر ہے یہاں زیادہ مقدار میں ہوا ہے۔ (لیکن لبرلزم کا یہ extreme profile سامنے لانے کے لیے زمین ابھی خاصی ہموار کرنی ہو گی! خدا کی شرم ختم کرنے میں انسان کو اُس پوائنٹ تک لے کر جانا کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہے؛ گو سال گزرتے رُت بدلتے پتا بھی نہیں چلتا!)۔

مسلمان: اور ایک تیسرے آدمی کا بُت کی پوجا کرنے کا فیصلہ بھی اتنا ہی قابل قدر ہوا؟

لبرل: ہم تمام مذاہب کو ایک برابر رکھتے ہیں۔ کوئی تفریق نہیں۔ کوئی خدا کو پوجے کوئی بُت کو، یہ اس کا مسئلہ ہے اور اسے ایسا کرنے کا حق ہے۔

مسلمان: ابلیس کا خدا کے حکم کو انکار کرنا اور ملائکہ کا خدا کے حکم پر سجدہ بجا لانا، دونوں قابل قدر؟

لبرل: کوئی کیا فیصلہ کرتا ہے، یہ بعد کی بات ہے۔ لبرلزم یہ کہتا ہے کہ ہر کسی کو اپنی مرضی کرنے کا حق دیں۔

مسلمان: آپ اپنی اِس عبارت میں صرف ایک لفظ کی تبدیلی کر لیں؛ میں آپ کا ہم

---

[1] دانشور، مصنف، داعی، لاہور،

خیال ہوجاتا ہوں۔اس سے وہ اشکال بھی ان شاءاللہ دور ہوجائے گا جو اس بحث کے مرکزی نقطہ پر مسلسل پردہ ڈالتا اور غیر ضروری طور پر اسے الجھاتا آرہا ہے۔

لبرل: کونسا لفظ؟

مسلمان: ''حق'' کی بجائے یہاں ''اختیار'' بول لیں۔یعنی (خدا کے امر و نہی کے آگے) ہر کسی کو اپنی مرضی کرنے کا اختیار دیں حق نہیں۔فریڈم (freedom) نہ کہ رائٹ (right)۔آپ دیکھیں حکمت اور عدل کے مالک خداوند نے ابلیس کو سجدہ سے سرتابی کا اختیار دیا تھا حق نہیں۔اسی لیے سجدہ نہ کرنے پر راندۂ درگاہ کر دیا اور آج تک انسانی لغت اسے مردود بولتی ہے۔بس یہی نقطہ ہے۔لوگوں کو آپ خدا کی فرماں برداری یا نافرمانی کا وہ ''اختیار'' دیں جس کے لیے انہیں روزِ قیامت خدا کے آگے جوابدہ ہونا اور جزا وسزا کا سامنا کرنا ہے البتہ خدا کی نافرمانی کا ''حق'' آج بھی نہیں۔اس کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی عبادت کو ان پر ''فرض'' اور خدا کی عبادت سے روگردانی کو ان کے حق میں ''گناہ'' ماننے والوں میں بہرحال رہیں۔خدا کی حدیں توڑنا ایک صریح ''پاپ'' یعنی ایک نہایت شنیع اور قابل اعتراض چیز معاشرے میں ضرور بنا رہے۔ (تعلیم اور ابلاغ میں اختیار کیے جانے والے لہجے اِس سلسلہ میں اہم ترین بلکہ فیصلہ کن ہوجاتے ہیں۔ہو نہیں سکتا کہ ایک ماحول میں پائے جانے والے ''ابلاغ'' اور ''تعلیم'' سے صاف ایک ''تصورِ زندگی'' نہ جھلک رہا ہو۔جبکہ انبیاء نے،سب سے پہلے،انسانوں کو کوئی چیز دی ہے تو وہ ''زندگی کا ایک تصور'' ہی ہے۔اور یہ ''تصور'' انسانوں میں انڈیلنے اور اسے اُن میں برقرار (live) اور روزمرہ زندگی سے متعلقہ (relevant) رکھنے کا نام: تعلیم یا ابلاغ)۔غرض خدا کی عبادت کی ایک سماجی رِٹ قائم رکھنا اور اس سے سرتابی کو ایک شجرِ ممنوعہ بنا رکھنا۔البتہ دھونس (forcing) سے احتراز۔یوں معیارات بھی قائم رہے (میزان)۔اور لوگوں کو آزادی بھی حاصل رہی (ابتلاء)۔

کیا یہ بات نہایت قرینِ انصاف نہیں جو اسلام نے چودہ سو سال پہلے بہت واضح الفاظ میں کر دی ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۖ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرۃ:256) ''دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت سے روشن ہوچکی، اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کرکے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے یقیناً وہ مضبوط کڑا تھام لیا، جو کبھی نہیں ٹوٹنے کا''۔ چونکہ انسان کو گناہ کا اختیار ہے حق

نہیں... لہٰذا؛ ''ہدایت اور ضلالت'' کا تصور بھی یہاں پوری طرح موجود رہا (قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ) جوکہ انبیاء کی بعثت کا اصل محور ہے، جبکہ ''انسانی آزادی'' بھی پوری طرح باقی رہی (لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ) جوکہ انسانی ہستی (فی الحقیقت آزمائش) کا مرکزی نقطہ ہے۔آپ کا کام بھی ہوگیا ہمارا بھی۔

لبرل: جی نہیں۔آپ کا کام ہوا ہے ہمارا نہیں۔ یہ تو وہی بات ہے جو آپ پہلے کہہ چکے۔ یعنی دھونس زبردستی نہ کرنا ہی کُل آزادی ہوئی۔ یہ وہ ''لبرٹی'' نہیں جس کی ہم بات کرتے ہیں۔ ''اختیار'' دینے کا کیا مطلب؟ وہ تو ہے ہی ہے۔تمہاری اِس ''ہدایت اور ضلالت'' والی لغت کو ہی تو ہم جہان سے ٹھکانے لگانا چاہتے ہیں۔تمہارا یہ ''حق اور باطل'' والا زعم ہی تو نکالنا ہے،جس کے بل پر یہاں مذاہب ایک دوسرے کو 'ٹھیک' اور 'غلط' کہنے چل دیتے رہے اور جس کے باعث انسانوں کے مابین مسلسل ایک روک ٹوک رہی۔ بھائی سب کا اپنا اپنا سچ ہے یہاں۔سب کا اپنا اپنا ٹھیک غلط ہے۔کوئی کسی پر معترض ہی کیوں ہو؟ مسئلے کو یہاں سے پکڑیے۔ ہر کسی کو اپنی مرضی کرنے کا مکمل ''حق'' ہے قطع نظر اس سے کہ وہ کیا مرضی کرتا ہے۔جی ہاں اختیار نہیں حق۔(''لبرٹی'' کی اصل تعریف)۔

اصولاً، یہاں اسلام کے تصورِ دعوت کا بھی خاتمہ ہوا۔ (بعید نہیں اپنے جدت پسند دبستان کے ہاں کچھ ایسا قولِ جدید اس وقت پراسیس میں ہو کہ: دعوت میں چونکہ لوگوں کے عقیدہ وعمل پر معترض ہونا آتا ہے اور یہ کام اگر ایک مہم (پیہم لگاتار عمل) کے طور پر ہو تو لامحالہ ایسی کشیدگی کا موجب ہوگا جو حکمت اور موعظہ حسنہ کے تمام تر التزام کے باوجود مکہ کی دو جماعتوں کے مابین 'مرحلۂ دعوت' میں بھی پیدا ہو کر رہی، جہاں قومی یکجہتی معدوم اور شہر کا چین تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ اور جوکہ 'دعوت' کے نام پر لوگوں کو ان کے دین و مذہب سے روکنے کا منطقی نتیجہ ہے... لہٰذا لوگوں کے مذہب اور طرزِ بود و باش سے یوں الجھنا ہی ناجائز ہوا تاوقتیکہ کوئی ایسا آسمانی پروانہ آپ اپنے پاس نہیں رکھتے جیسا رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جزیرۂ عرب میں ایک مخصوص عرصے کے لیے منجانب اللہ عطا تھا، اور جس کے بل پر مکہ میں یہ کشیدگی کھڑی کر لینا روا کیا گیا؛ ورنہ اصل تو آزادی، رواداری اور ہم آہنگی ہے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد البتہ 'کسی کا یہ منصب نہیں' کہ وہ لوگوں کی زندگیوں میں 'دعوت' کے نام پر یوں مداخلت کرے اور ان کے مذہب، ان کی تہذیب اور ان کے طرزِ بود و باش پر یوں معترض ہوتے ہوئے مختلف سماجی ہتھیاروں سے ان پر حملہ آور ہو۔لہٰذا دورِ نبوت کے بعد جن

جن لوگوں نے ''دعوت'' کا یہ منصب ہاتھ میں لیا اور وہ اپنے زبان و بیان سے لوگوں کے بتوں یا ان کے طور طریقوں کی خبر لینے چل دیے وہ صریح زیادتی کے مرتکب رہے!)۔ دعوت ظاہر ہے ایک ''غلط'' دین سے ''صحیح'' دین پر آنے کی تحریک اٹھانے کا نام ہے۔ شرائعِ آسمانی کے حرام کردہ امور سے ''روک ٹوک'' کرنے اور شرائع کے فرض کردہ امور کا لوگوں کو ''پابند'' کرنے سے عبارت ہے۔ (اب اگلے مرحلے میں شاید اِسی کا ہی گھونٹ بھرا جائے)۔ دینِ انبیاء کا ایک بڑا حصہ دراصل ہے ہی نفسِ انسانی کو اس کی خواہش و شہوت سے روک کر تزکیہ (پاکیزگی) کی چڑھائی چڑھانا اور پورے ایک معاشرے کو اس پاکیزگی پر لانا اور پھر اسی پر رکھنا، جس سے طبیعتیں بہرحال بھاگتی ہیں۔ یہاں؛ آسمانی دلیل کی روشنی میں آپ جہاں لوگوں کا عقیدہ وعمل فاسد دیکھیں تو اچھے اسلوب کے ساتھ سہی مگر ایک درجے میں اس پر معترض آپ بہرحال ہوتے اور اس کے خلاف ایک سماجی مزاحمت ضرور اٹھاتے ہیں۔ یوں معاشرے میں شہوات کے لشکروں کے ساتھ مسلسل برسرِپیکار رہتے ہیں۔ اور یہ دعوت کا باقاعدہ حصہ ہے)۔ یہاں 'لبرلزم' کی گنجائش!؟

مسلمان: تو یہ ہے شخصی آزادی؟

لبرل: جی ہاں۔ آپ جو ''اِکراہ'' (زبردستی) سے ممانعت پر اکتفا فرما رہے تھے، اُس کا نام آزادی نہیں ہے۔ لبرٹی آتی ہے اصل میں سماجی قیود ہٹانے سے۔ یہ سماجی قدغنیں برقرار ہوں اور taboos کی تلواریں ذہنوں پر لٹکتی ہوں تو کون اس کو ''آزادی'' کہتا ہے؟ یہ تو ''ظالم سماج کا جبر'' ہوا جو طعنے دے دے کر ہی ایک 'غلط کار' کا جینا دوبھر کر دے؛ جس کے باعث فرد کی آزادی شدید متاثر ہوتی ہے۔ ''لبرلزم'' اس صورتحال کا معاشرے میں باقاعدہ نوٹس لیتا ہے اور آزادی کے اس 'اصل' معنیٰ کو وہاں ممکن بناتا ہے۔ بھئی ایک عاقل بالغ شخص جس بھی چیز کو اپنے لیے ٹھیک سمجھے یا پسند کرے، بس اُس کا حق ہے۔ اُس کی اپنی رائے آپ کی اپنی۔ اُس کی اپنی زندگی آپ کی اپنی۔ جب تک اُس کا وہ فعل خود آپ کی آزادی میں مخل نہیں، آپ اُس کو ٹوکنے کے مجاز ہی نہیں۔ محض ''اختیار'' کی کیا بات؟ یہ اُس کا ''حق'' ہے۔ اس پوائنٹ تک آنا پڑے گا آپ کو معاشرے کے ساتھ۔

مسلمان: یعنی کفر کرنا، زنا کرنا انسان کا حق ہے محض اختیار نہیں؟ یہ تو جہمیہ اور قدریہ سے بدتر قول ہوا۔

لبرل: پہلے کہہ چکا ہوں، میں ریاستی قانون کو مستثنیٰ رکھتا ہوں۔ لہٰذا زنا وغیرہ کے متعلق

اِس ملک میں ('فی الحال') بات کرنے سے احتراز کروں گا۔

مسلمان: یعنی ریاستی قانون ہی ایک چیز ہوئی، ورنہ زنا کرنا انسان کا حق ہے؟ سود؟ جوا؟ لواطت؟ 'بن بیاہی ماں' ہونا آپ کی صاحبزادی کا ایک باقاعدہ حق، جس سے آپ اُسے روک نہیں سکتے؟ بھائی کا بہن کے ساتھ، باپ کا بیٹی کے ساتھ 'باہمی رضامندی' سے حرامکاری کرنا؟ کوئی پابندی ہوسکتی ہے تو 'ممکنہ ضرر رسانی' کی دلیل سے کنڈوم (condom) رکھنے یا بچہ ٹھہرنے سے بچانے کے لیے کچھ اور ترکیب نکالنے کی؛ کیونکہ ایسے بچے کے اپاہج پیدا ہونے کے امکانات بڑھے ہوتے ہیں؟ (فحش نگاری مقصود نہیں، معاملے کی سنگینی واضح کرنے کے لیے کچھ صریح الفاظ استعمال کرنا پڑے)۔ اصل چیز اب سامنے آئی، یعنی فرائڈ والا حیوان جسے پٹہ ہو تو صرف گورنمنٹ کا۔ باقی ہر قید، ہر وعید، ہر ضابطۂ اخلاق بیچ میں لانا اور معاشرہ میں اس کو دستور ٹھہرانا منع۔ تو پھر ''احکامِ خداوندی'' کا کیا سٹیٹس (status) رہا آپ کے یہاں؟ آسمانی رسالتوں اور شرائع کو آپ نے کہاں پر رکھا؟

لبرل: آسمانی شرائع پر آپ خود عمل کریں نا جتنا کرنا چاہتے ہیں، کس نے آپ کو روکا ہے؟ انسانی آزادی وہ اصل ویلیو ہے جس پر کوئی کومپرومائز نہیں۔ آزادی بمعنیٰ حق۔ اِسی سے ''حقوق'' rights کے سب مباحث آتے ہیں ہمارے لبرل پیراڈائم میں۔

مسلمان: کیا آپ خاتمی آسمانی رسالت ''قرآن'' کو مانتے ہیں؟ چلیے، انجیل اور توراۃ کو؟ کسی آسمانی صحیفے کو؟ أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ؟ اس کی رُو سے بات کرلیں کہ انسان کو کس بات کا 'حق' ہے اور کس بات کا خدا کی اِس زمین پر انسان کو کوئی 'حق' نہیں؟ 'اختیار' کی اور بات ہے، جو کہ ہمیں تسلیم ہے۔ 'حق' کی بات ہو رہی ہے۔

اس آخری سوال (کیا آپ قرآن کو مانتے ہیں) کا جواب بالعموم گول! (پاکستانی پبلک میں قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا 'ابھی' لبرلسٹ کی ریڈ لائن ہے اور کچھ سال اِس کا 'وہ' جواب شاید پبلک میں آنے کی غلطی نہ کرے۔ کچھ گنجائش 'فی الحال' ہے تو سوشل میڈیا پر یا پھر یونیورسٹی کلاس روموں میں، جو ایک چیز کا اندازہ کروانے کے لیے کافی تو بہت تھا، اگر آپ جاگ جانے پر آمادہ ہوتے)۔

آخر کھلا یہ کہ لبرل کی بحث اسلام کی 'تحقیق' سے متعلق کبھی نہ تھی۔ اِس اعتبار سے؛ نہ مولوی کے ساتھ اس کا کوئی الجھاؤ نہ مفتی کے ساتھ۔ جمہور علماء اس کا مسئلہ اور نہ غیر جمہور۔ نہ یہ

فرقہ نہ وہ مسلک ۔ (مولوی کی ’فرقہ واریت‘ لبرل کے لیے محض ایک سیلنگ پوائنٹ (selling point) ۔ لبرل کا اپنا تعرُّض البتہ نہ اجماع سے اور نہ حدیث کی کسی سند یا متن یا علت یا روایت یا تدوین یا تخریج سے ۔ نہ صحیح اور نہ ضعیف ۔ نہ بخاری نہ مسلم نہ صحاح ستہ ۔ نہ کنز نہ ہدایہ ۔ نہ فقہاء نہ محدثین نہ مفسرین ۔ کسی سے اِس کو معاملہ نہیں ۔ نہ قرآن، نہ متواتر اور نہ اُحاد ۔ نہ لغت اور نہ تفسیر ۔ نہ قطعی اور نہ ظنی ۔ یہ سب بحثیں اگر یہ کرے گا یا ایسی بعض بحثوں کی سرپرستی فرمائے گا اور ان کے لیے اپنے چینل میں ’پروگرام‘ کی گنجائش نکالے گا تو ایک معاملے کو الجھانے یا دینداروں کو بانٹنے اور اسی حساب سے مسلم معاشرے میں وقت اور گنجائش لینے اور اپنے اصل ایجنڈا کی خاطر زمین ہموار کرنے کے لیے ۔ پس یہ تو ٹیکٹکس (tactics) ہوئے (کیونکہ مسلم معاشرے میں قدم لگانا آسان بہرحال نہیں ہے) ۔ فقہ پر جا بجا سوال اٹھانا، حدیث کو شریعت کا ماخذ نہ ماننا یا اجماع کا انکار وغیرہ ایسی جدت پسند ’’اسلام‘‘ کی شروحات تو اِس تیز رفتار گاڑی کے ’شاکس‘ (shock absorbers ہیں) ۔ مگر فی نفسہٖ یہ بحثیں لبرل کا سروکار نہیں ۔ وہ تو پیدا کرنے والے کو اس مقام سے ہی فارغ کر چکا کہ بنی نوعِ انسان کو وہ اجتماعی طور پر کسی بات کا ’’پابند‘‘ کرے ۔ لبرل کا جھگڑا سیدھا اُس خدا کے ساتھ، جو اِسے ’’معاشرت‘‘ کے متعلق اپنے احکامات (commandments) پہنچانے کے لیے زمین میں رسول بھیجتا اور اِس کے لیے حق و ناحق کے پیمانے (میزان) ٹھہرانے کے لیے کتابیں اتارتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس ’’میزان‘‘ کے کچھ حصے وہ زمین پر اس حیثیت میں دستیاب کراتا ہے کہ یہ کرۂ ارض کی ان تمام ملتوں کی زبان پر بیک آواز بولیں جو آسمان سے کچھ بھی اترنے کی دعویدار ہوئیں ۔ آسمانی پیغام کے اس (تمام ملتوں کے ہاں متفق علیہ (unanimous) چلے آتے) حصے کو بھی یہ اہل زمین کے لیے دستور ماننے پر آمادہ نہیں ۔ کیونکہ ... ایک بار اگر آسمانی پیغام کے اس حصے پر آنا قبول کر لیا گیا اور اس کو ’’پابندی‘‘ کا سرچشمہ مان لیا گیا تو خالق کے ’’فرمائے‘‘ کا مقام زمین میں طے ہو گیا ۔ نیز ’’رسالت‘‘ کا ادارہ اصولاً اسٹیبلش (establish) ہو گیا، جس کے بعد اس کا تسلسل ڈھونڈنا رہ جاتا ہے جو خدا کے فضل سے وہ روشن آفتاب (سِرَاجًا مُّنِیۡرًا) ہے جسے جھٹلانے کے لیے دن کو رات کہنا پڑے ۔ یہ سب نہ بھی ہو، انسانی مرضی سے بالاتر ایک مرضی اس صورت میں واجب الاتباع بہر حال مان لی گئی اور انسان دیوتا کی ’’لبرٹی‘‘ پر وہ آسمانی قید ایک اصول کے طور پر تسلیم ہوئی جو اہل ایمان کے کیس کا مرکزی نقطہ ہے ۔ مگر نہیں ۔ اُس آسمانی ہستی اور اُس کے فرستادہ رسول ہی کو زمین

پر اپنے اختیارات کے معاملہ میں اب لبرل کی مقرر کردہ حدود میں رہنا ہوگا! معاذ اللہ

اور جب ایسا ہے... تو اے دین کے داعیو! بے شک یہ لبرل آج تمہیں نشانۂ طعن بناتا اور اپنے 'ترقی پسند' ادب کی دھار پر تمہیں رکھتا ہے... مگر اِس کی جنگ درحقیقت تمہارے ساتھ نہیں۔ اِس کی خصومت، سیدھی خدا کے ساتھ۔ تمہارا شرف بس اِتنا کہ تم آج زمین پر اُس خدا کی بات سکھانے پڑھانے والے ہو۔ یعنی انبیاء والی آزمائش سے کچھ معمولی سا حصہ۔ جو تمہارے لیے صد ہا سعادت کا باعث ہونا چاہئے۔ قَدْ نَعْلَمُ إِنَّهُ لَيَحْزُنُكَ الَّذِي يَقُولُونَ فَإِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُونَكَ وَلَكِنَّ الظَّالِمِينَ بِآيَاتِ اللَّهِ يَجْحَدُونَ (الأنعام: 33) ''ہم کو معلوم ہے (اے نبی) کہ ان کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں (مگر) یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم خدا کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں''۔]

مختصر یہ کہ... زمین خدا کی اور اصول قاعدے لبرل بہادر کے!

صرف وہ وثیقہ ناپید ہے جس میں خدا نے یہ زمین لبرل کے نام الاٹ کر دی اور خود یہاں سے دستبرداری اختیار کر لی! (معاذ اللہ)

مَّا أَشْهَدتُّهُمْ خَلْقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَا خَلْقَ أَنفُسِهِمْ وَمَا كُنتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّينَ عَضُدًا (الکہف: 51)

''میں نے ان کو نہ تو آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت بلایا تھا اور نہ خود ان کے پیدا کرنے کے وقت۔ اور نہ میری یہ شان کہ گمراہ کرنے والوں کو اپنا کچھ بھی مددگار بناؤں''۔

لبرلزم، الحاد اور اسلام

لبرلزم الحاد کی ایک خاص حد کو پہنچے بغیر ایک طرح سے ادھورا ہے۔ دونوں کے مابین اشتراکِ عمل یا تمکینِ باہمی (mutual facilitation) ایک معلوم واقعہ ہے۔ بلکہ چولی دامن کا ساتھ۔ کبھی نہ ہوگا کہ ان میں سے ایک کسی معاشرے میں ترقی کر لے اور دوسرا پیچھے رہ جائے۔ ایک ہی کشتی کے دو سوار؛ یہ پار لگیں گے (خدانخواستہ) تو دونوں، اور ڈوبیں گے تو (ان شاء اللہ) اکٹھے۔ لبرلزم کا حتمی نتیجہ یا غایت (final destination) الحاد ہی ہے۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں، لبرلزم الحاد کا ہراول ہے۔ ایک ایمانی معاشرے پر حملہ آور ہوتے وقت یہ دونوں بڑے طریقے سے آگے پیچھے آتے ہیں۔ ایک کچھ راستہ صاف کرتا ہے تو دوسرے کی پیش

قدمی طوفانی رفتار سے ممکن ہوتی چلی جاتی ہے۔ دوسرا جیسے جیسے صورتحال پر حاوی ہوتا ہے پہلے کی پہنچ آگے تک بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایک بوتا ہے دوسرا کاٹتا ہے۔ دونوں کے مابین اِس ربط یا اِس ہم آہنگی کی نشاندہی دورِ حاضر کے علمائے عقیدہ کے زبان و بیان میں کثرت سے ہوئی ہے۔

لبرلزم کی چھوڑی ہوئی کچھ 'خالی جگہیں' ایک معاشرے میں لازماً الحاد کو پُر کرنا ہوتی ہیں۔ یہ کام ایک الگ محور پر ماحول میں خود بخود ہو رہا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی یہ ہو رہا ہے، اگر آپ نظر اٹھا کر صرف دیکھ لیں۔ ایک سیلاب جو آپ کا بہت کچھ بہا لے جانے کو ہے خصوصاً تعلیمی اداروں میں، جو آپ کے مستقبل کا ایک 'سافٹ ویئر' یا ایک نقشہ نما ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ ہمارے بہت سے فُضَلاء پھر بھی انجان بنے نظر آتے ہیں۔ خصوصاً وہ اصحاب جن کا اِن تعلیم گاہوں میں روز آنا جانا ہے اور جہاں یہ ایک بھیانک تصویر بچشم سر ملاحظہ فرماتے ہیں۔ پھر بھی یہ اس جوڑ (connection) کو جو لبرلزم اور الحاد کے بیچ ہے، ابھی تک کچھ لوگوں کا واہمہ سمجھتے ہیں! ادنیٰ تامل سے آپ یہ جان سکتے ہیں کہ دونوں پراجیکٹس کے پیچھے تقریباً ایک ہی ذہن کام کر رہا ہے۔ گویا یہ ایک ہی پروگرام کی دو مختلف سطحیں ہیں۔ یہاں تک کہ ایک جگہ پر جا کر اِن دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ (لبرلزم کی اگر کئی قسمیں ہیں تو الحاد کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں 'خدا کے وجود کا انکار' الحاد کی کوئی واحد صورت نہیں)۔

لبرلزم اور الحاد کو علیحدہ علیحدہ پیش کرنے کی غیر معمولی کوششیں ہمارے معاشرے میں یقیناً ہیں؛ اور اس کے پیچھے کئی لامتناہی 'مصلحتیں'! آج جو شخص یہاں 'الحاد سے پاک لبرلزم' بیچ رہا ہے وہ یا تو مارکیٹنگ کا گھاگ ہے جو مذہبی دنیا میں لبرلزم کے گاہک بنانے کی مشکل ترین مہم سر کرنے میں جُتا ہے۔ یا وہ ایک سادہ لوح شخص جسے آپ لبرلزم کی اس گھاگ مارکیٹنگ کا متاثرہ (victim) کہہ سکتے ہیں۔ ہاں ان سادہ لوحوں میں ہمارے بہت سے بھائی ہو سکتے ہیں۔ اِن سے ہماری محبت اور اخوت ان شاء اللہ برقرار ہے جب تک یہ روئے زمین کے جملہ انسانوں کو نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں آنے کا ''پابند'' مانتے رہیں۔ جب تک یہ اس ''پابندی'' کو ''لازم'' ٹھہرائیں تب تک یہ صحیح لبرلسٹ تو ان شاء اللہ کبھی نہیں ہو سکتے بلکہ اسلام کا یہ بنیادی عقیدہ مان لینے کے بعد تو یہ لبرل عقیدہ کے اصل الاصول ہی کے منکر ہوئے (تبھی ہمارا رشتۂ اخوت اِن کے ساتھ برقرار ہے)۔ ہاں یہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت میں آنے کی) اِس ''پابندی'' کو روئے زمین کے جملہ انسانوں پر برقرار رکھتے ہوئے خود اس 'لبرلزم' کی کیا توجیہ کرتے ہیں جس کی یہ وقتاً فوقتاً تحسین فرماتے ہیں، ہماری باٹم لائن (خدا کی

عبادت اور محمد ﷺ کی اطاعت کا روئے زمین کے جملہ انسانوں پر ''فرض'' اور binding یعنی ''پابندی'' کا موجب ہونا) جب تک اس سے متاثر نہیں ہوتی تب تک وہ ہماری نظر سے ثانوی اہمیت کی بات ہے اگرچہ اِن کی وہ (لبرلزم کی) توجیہ یا تفہیم ہمارے نزدیک کتنی ہی غلط اور لبرلزم کی اصل حقیقت سے کتنی ہی ہٹی ہوئی ہو۔ اس کے لیے ہمارے اصولِ اہلِ سنت میں ایک بہت رحمدل قاعدہ پایا جاتا ہے: "لَازِمُ الْقَوْلِ لَيْسَ بِقَوْلٍ". یعنی ایک شخص کی بات سے محض لازم آجانے والی بات کو اس کی اپنی بات قرار نہیں دیا جا سکتا جب تک وہ اُس (لازم آنے والی) بات کو بھی خود اپنے منہ سے نہ بولے اور اسے باقاعدہ اپنا عقیدہ قرار نہ دے۔ (اِس رحمدل و مبنی بر عدل قاعدہ کی وضاحت ان شاء اللہ کسی اور موقع پر کریں گے)۔ بہرحال اِس قاعدہ کی رُو سے ہم اپنے ان لاتعداد بھائیوں کے لیے ایک عذر رکھتے ہیں جو لبرلزم کی کسی دامِ ہمرنگِ زمیں تفسیر (Trickery) سے متاثر ہو بیٹھے تاہم اپنے اسلامی عقیدے (روئے زمین کے جملہ انسانوں پر محمد ﷺ کی ''اطاعت'' میں آنے اور آپ ﷺ کی ایک ایک بات کا اعتقادی، عملی، سماجی، قانونی، دستوری، سیاسی ہر ہر سطح پر ''پابند'' ہونے کو فرض ماننا) سے دستبردار نہیں ہوئے۔ اِنھوں نے لبرلسٹ کی کسی چکنی چپڑی عبارت پر یقین کر کے اُسے اسلامی عقیدہ کے منافی نہ ہونے کی سند دے ڈالی یا لبرلزم کے لیے کلمۂ خیر تک بول دیا، جبکہ نبی آخر الزمان ﷺ کی رسالت اور آپ ﷺ کی شریعت کی ایک ایک بات کا یہ بائنڈنگ سٹیٹس ہمارے اِن بھائیوں کے ہاں ہر بحث اور اختلاف سے بالاتر رہا۔ جب تک اِن کا یہ عقیدہ برقرار، یہ ہم سے اور ہم اِن سے، کیونکہ اسلام محمد ﷺ کی اطاعت کو واجب جاننے کا نام ہے۔

البتہ خود اس لبرلزم اور لبرلسٹ کے لیے کوئی نرمی رکھنا، جبکہ وہ روئے زمین کے ہر ذی نفس کو محمد ﷺ کی اطاعت میں آنے کا پابند نہ مانے اور محمد ﷺ کے ٹھہرائے ہوئے حلال کو جملہ انسانوں کے حق میں حلال، حرام کو حرام اور فرض کو فرض نہ ٹھہرائے، نیز اس لبرلزم کے پیچھے چلے آنے والے الحاد سے آنکھیں بند رکھنا جو کہ درحقیقت اس لبرلزم کا تتمہ (addendum) ہے، ایک باخبر شخص کے حق میں ظلم عظیم ہے۔ شرک کی اس برہنہ دعوت کے آڑے آنا وقت کا ایک اہم فریضہ اور امت کی خیر خواہی کا ایک بنیادی تقاضا۔ جیسا کہ ہم دیکھ آئے، لبرل کو دراصل اِس دعوت ہی کے ساتھ پرخاش ہے کہ انسانوں پر اپنے پیدا کرنے والے کی عبادت اور اطاعت فرض ٹھہرائی جائے، خصوصاً یہ کہ اِس عبادت اور اطاعت کی مفصل صورت جاننے

کے لیے اُس کے بھیجے ہوئے رسولوں کا دامن تھامنا لازم اوران کی ایک ایک بات ماننا اوراس کو دستور ٹھہرانا واجب (binding) کر رکھا جائے۔ غرض نہ توحید کا لزوم اور نہ رسالت کا۔ بلکہ توحید اور رسالت کے (کرۂ ارض کے ہر شخص کے حق میں) اِس بائنڈنگ سٹیٹس کو منوانے کی دعوت کے ساتھ قدم قدم پر لبرل کا الجھنا۔ خدا کا وہ مرتبہ اور مقام ہی جو آسمانی صحیفوں میں درج اور انسانی فطرت میں کندہ کر رکھا گیا ہے، یعنی اُس کا مطلق لائقِ عبادت اور واجبِ اطاعت ہونا اور اُس کے بھیجے ہوؤں کی ایک ایک بات کو binding (''پابندی'' کا موجب) ماننا، اس (لبرل) کے ہاں ردّ ہے اور اس کے خلاف تحریک اٹھانا واجب۔

لبرلزم کے متعلق یہ درست نہیں کہ یہ تو صرف مذہب کا بزور نفاذ کرنے کے خلاف ہے، تاہم اگر مذہب کی کوئی بات ''اکثریتی منشا'' (majority will) کی راہ سے ''ریاستی قوانین'' میں ڈھلی ہو تو یہاں لبرلزم کو کوئی پرابلم نہیں۔ ایسی بات ہوتی تو لبرلسٹوں کو پاکستان کے ان قوانین کے ساتھ بھلا کیا مسئلہ ہونا چاہئے تھا جو مذہب سے ماخوذ ہیں؟ مگر کسے نظر نہیں آ رہا کہ لبرلسٹ ایجنڈا کی ساری جنگ ہی اُن قوانین کے ساتھ ہے جن کا حوالہ یہاں پر دین اسلام ہے؟ اور کیا لبرلزم کی باتوں میں آیا ہوا ہمارا کوئی اسلامی بھائی یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ لبرلزم یا لبرلسٹوں کو یہاں کے اسلامی قوانین کے ساتھ ہرگز کوئی مسئلہ نہیں؟ ساری جنگ تو اِسی ایک نقطے پر ہے! ریاستی قوانین میں پائی جانے والی ایک واضح معلوم ''اسلامی بات'' کو یہاں جیسے ہی کسی عدالتی یا انتظامی راہ سے 'عملدرآمد' کی ہوا تک لگتی ہے، لبرلسٹوں کے منہ سے غصے کی وہ جھاگ برآمد ہونے لگتی ہے جو اپنے مضمرات میں پورے جہان کی ماحولیات کو متاثر کرنے تک جاتی ہے۔ جیسے ہی ریاست کا کوئی اہلکار یہاں ''دستور'' یا ''قانون'' میں موجود کسی اسلامی بات کو لاگو کرنے کی طرف آتا ہے یہاں کا لبرل ابلاغ اور دانشوراسے بھانپ کر ہی ایسے کسی ''ممکنہ'' عدالتی یا انتظامی اقدام کے خلاف سرگرم ہو اٹھتا اور اپنی گوناگوں مہارتیں اسے 'سیاہ' بنا کر پیش کرنے پر جھونک دیتا ہے۔ اس کھلی کہانی کو سمجھنے میں ہمارے اِن بھائیوں کو آخر کیا رکاوٹ ہے جو یہاں کے عام آدمی تک پر عیاں ہے؟ ''مذہب'' کو یہاں کی قومی اجتماعی سرگرمی سے باہر کرنا، لبرلزم کی یہ واضح انسپی ریشن (inspiration) آخر کس پر مخفی ہے؟ اور اگر لبرلزم یہ ہے تو ''اللہ اور رسول کے خلاف محاذ آرا'' ہونا آخر کس انسانی رویے کا نام ہے؟

''اکثریتی منشا'' (majority will) اور ''ریاستی قوانین'' (state laws) کی

اطاعت کا حوالہ جو ایک لبرل بیانیہ میں ملتا ہے، مذہب کے لیے وہاں سے کچھ 'گنجائش' پانا اور لبرلزم کے ساتھ ایک مشترکہ روٹ پر جا چڑھنا ہمارے ان مذہبی حضرات کی خام خیالی ہے جو لبرلزم کے لیے نیک جذبات کے متمنی ہیں۔ ''اکثریتی منشا'' اور ''ریاستی قوانین'' کی اطاعت کا جو حوالہ ایک حقیقی لبرل دیتا ہے، اس کا سیاق اصل میں بالکل اور ہے۔ بے شک اس لبرل بیانیہ میں ایک گونہ تلبیس (deception,enveloping) ہے، جسے 'حالیہ مرحلہ' میں اس کی مجبوری سمجھیے، اور جو کہ بہت دیر تک شاید اسے لاحق نہ رہے، تاہم اس کی اِن پھسلن سے پُر عبارتوں کے باوجود اگر غور کیا جائے تو اب بھی وہ اِن میں کچھ بہت متناقض (inconsistent) نہیں ہے۔ لبرلزم کے متعلق ہمارے یہ خوش گمان بھائی جس بات کو نظر انداز کرتے ہیں وہ یہ کہ لبرلسٹ کے ہاں پہلے ریاست کا ایک ''تصور'' ہے اور وہ ہے دین سے کلی آزاد ریاست۔ اس کے بعد ریاست کا وہ ''سٹیٹس'' ہے جس کی رُو سے ریاست کے صادر کردہ ''قوانین'' وہ واحد چیز ہو سکتے ہیں جسے مخلوقِ خدا پر واجب الاتباع ٹھہرایا جائے۔ پس ایک لبرلسٹ جس وقت ریاست کے صادر کردہ قوانین کا اصولی ''سٹیٹس'' بیان کرتا ہے اس وقت ریاست کا لبرلسٹ ''تصور'' اس کے ہاں پوری طرح implied ہوتا ہے، جسے وہ ایک دوسرے مقام پر کھل کر واضح (express) کرنے میں بھی ہرگز تردُّد نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ جب وہ اس دوسری سطح پر بات کرتا ہے تو وہ ان قوانین کو جن کا سرچشمہ اسلام ہے، غلط ٹھہرانے میں کوئی ابہام نہیں چھوڑتا اور ایسے 'اسلامی' قوانین کو ختم کرنے کی آواز اٹھانے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتا۔ مگر ان میں سے ہر چیز کا اس کے ہاں اپنا اپنا محل ہے۔ لبرلزم کے یہ دو محور کچھ ایسے متناقض (contradictory) نہیں۔ دراصل ہمیں چاہئے تھا کہ ایک نظریے کو ہم اس کی کلیت (totality) میں لیں اور اس کے تمام سرے ملا کر اس کا ایک مجموعی مفہوم اخذ کریں اور پھر اس کی ہر جزوی یا ضمنی عبارت کو اس کے کلی عقیدے کے تحت لا کر تفسیر کریں۔

چنانچہ لبرلسٹ ان دو الگ الگ محوروں پر بیک وقت سرگرم ہے: وہ ریاست کی اس ''حقیقت'' کو بھی بیان کرنے میں کسر نہیں چھوڑتا جس کے تحت وہ ریاست کو مذہب سے آزاد کرانے اور اس میں پائے جانے والے ''اسلامی قوانین'' کو ختم کروانے کے دوٹوک مشن پر ہے۔ جبکہ ایک دوسری سطح پر وہ ریاست کا یہ ایک اصولی سٹیٹس بھی واضح کر جاتا ہے کہ اگر کسی چیز کی اطاعت کا قلادہ وہ خدا کی مخلوق کے گلے میں چھوڑنے کا روادار ہو سکتا ہے تو وہ ریاست

ہے (جو انسان دیوتا کے اکثریتی منشا [Human's majority will] کے ظہور کا محل ہے)۔ لبرلسٹوں کا پورا بیانیہ دیکھیں تو کوئی شک نہیں رہتا کہ ایک صحیح معنیٰ میں واجبِ اطاعت ریاست وہی ہے اور صرف اُسی کا ایک ایک قانون سر آنکھوں پر رکھنے کا، جو ''دین'' کی پابندی اور ''خدا'' کی عبادت سے آزاد ہو۔ غرض یہ دو محور لبرل کے ہاں الگ الگ سطح پر جاری رہتے ہیں:

۱۔ انسانوں کا اپنی اجتماعی دستوری زندگی میں صرف اور صرف ریاست اور اس کے قوانین کا ''پابند'' ہونا۔

۲۔ جبکہ اس ریاست کا مذہب ایسی ہر قید سے ''آزاد'' ہونا۔

بلکہ لبرل عقیدہ کی سپرٹ اگر سامنے رکھی جائے تو ریاست اور اس کے قوانین کی قید تو وہ بامرِ مجبوری قبول کرتا ہے ورنہ اصل تو اس کے ہاں ''فرد'' کی آزادی ہے، ہر قید سے۔ البتہ اس ریاست کا ''مذہب'' سمیت ہر قید سے زیادہ سے زیادہ (maximum) آزاد ہونا اس کے عقیدہ کا اصل الاصول ہے اور اس کے ہاں پائی جانے والی مطلق قدر absolute value۔ یعنی دوسری بات اُس کے ہاں پہلی سے اہم تر ہے۔ یوں لبرل عقیدہ کا زور انسان کو ریاست کی اطاعت میں ''لانے'' پر اتنا نہیں جتنا کہ اس انسان اور اس کی ریاست کو خدا کی اطاعت سے ''نکالنے'' پر۔ جبکہ ہمارے بھائیوں کا یہ خیال کہ پہلی چیز میں یہ لبرل کے ساتھ ہوں گے تو دوسری چیز میں لبرل (اپنا اصل الاصول چھوڑ کر) شاید اِن کے ساتھ ہوگا! حالانکہ وہ دونوں چیزیں ایک خاص ترتیب اور ساخت (construction) سے ہی لبرلزم کی تشکیل کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ پہلی چیز کے بغیر تو لبرلزم کی بعض نادر اقسام (some rare species of Liberalism) پائی جا سکتی ہیں مانند انارکسٹ لبرلزم (anarchist liberalism) جو ویسے معاشروں میں کم ہی پنپ سکا ہے اور خود لبرلز کی اکثریت اس کو رد کرتی ہے، تاہم دوسری چیز کے بغیر تو لبرلزم کا پایا جانا غیر متصور ہے۔ ''خدا'' اور ''ریاست'' کے راستے الگ الگ ہونا.. بلکہ ''خدا'' اور انسان کی ''اجتماعی ہیئت'' کے راستے الگ الگ ہونا.. لبرلزم کی مرکزی ترین حقیقت ہے۔ داد دینی چاہیے جو اس کو اسلام سے ہم آہنگ کر دکھائیں!